

DAMAGE BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222903

UNIVERSAL
LIBRARY

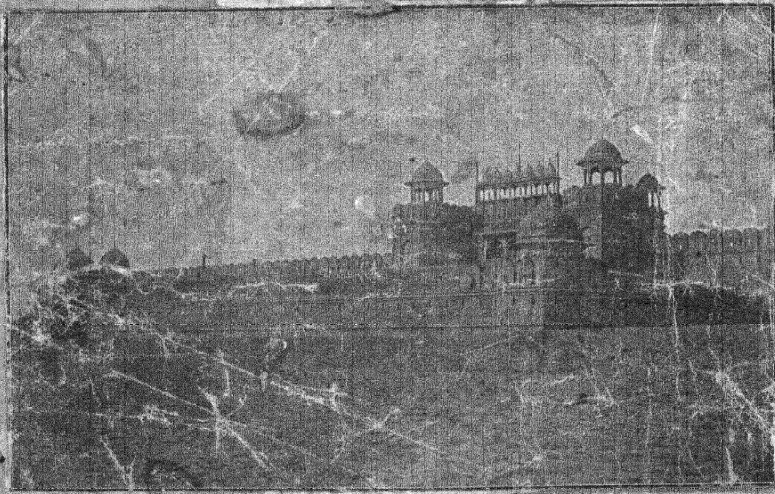
کتب خانہ
علی گڑھ

بابت جولائی ۱۹۲۳ء

جلد سوم

حصہ یازدہم

اردو



۳۹۰

انجمن ترقی اردو

کا

شہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون نگار	مضمون
۳۲۵	ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بجنوری مرحوم و مغفور	اصطلاحاتِ علمیہ
۳۴۱	جناب عالم جمال صاحب سابق مدیر مساوات محرم	ہنگامی زبان پر مسلمانوں کے احسانات
۳۵۳	حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس	آثار الکرام
	مترجمہ جناب سید راس مسعود صاحب بی اے (دکن)	خطبات گارسان دماسی
۳۹۵	آئی ای ایس ناظم تعلیمات حیدرآباد (دکن)	غالب کے نئے کلام کا انتخاب
	جناب مولوی سید ہاشمی صاحب کن دارالترجمہ	یہودی (از روسی مَصْنَف ٹرگی نف)
۴۱۳	عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن)	تبصرہ
۴۲۳	مترجمہ جناب سید فضل حسین صاحب	
۴۴۶	اڈیٹر	



۸۹۱۵۶۲۰۵

۱۳۰۵
۱۱/۵/۵۵

تیمت
۴

وضع اصطلاحاتِ علمیہ

(از ڈاکٹر عبد الرحمن بنجوری مرحوم و مغفور)

چند سال ہوئے جب کہ انجمن ترقی اُردو، سررشتہ تالیف و ترجمہ (حیدر آباد دکن) کے اتحاد سے وضع اصطلاحاتِ علمیہ کا کام انجام دے رہی تھی، میں نے اپنے چند فاضل احباب سے یہ التجا کی کہ وہ اس اہم مسئلہ کے متعلق اپنی اپنی رائے تحریر فرمادیں تو میں اُن سب کو ایک کتاب کی صورت میں طبع کر کے شایع کر دوں، تاکہ عام طور پر دوسرے اصحاب کو اس پر غور کرنے اور رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہ مضمون میری درخواست پر تحریر فرمایا تھا۔ میں کسی طرح یہ بھول نہیں سکتا کہ ڈاکٹر مرحوم کی بے وقت وفات سے ہمارے ملک اور خاص اُردو زبان کو کس قدر شدید نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے زبان کی موجودہ ضرورت پر غور کیا تھا اور ہر مسئلہ پر قطعی اور صاف رائے رکھتے تھے۔ اُمید ہے کہ یہ عالمانہ مضمون غور سے پڑھا جائے گا اور اگر کوئی صاحب اس مسئلہ پر اُردو میں اپنی رائے کا اظہار فرمائے گا،

تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ (ڈیڑر (۱۱) لے زبان و طاقت میں نمونہ قدرت اُتی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو راگھوں نہ کھو اور اس قدرت

کو خاک میں نہ ملا۔ .. (مولانا حالی)

زبان نے انسان کو اشرف المخلوقات کا لقب دیا ہے۔ عقل کے اظہار کا ذریعہ نطق ہے اور نطق انسانی کا مشر پیرایہ عقل ہے۔ اتحادِ زبان تن قومی کی رُوح رواں اور جسم ملی کی جان ہے۔ زبان ہی وہ بنیاد ہے جس پر سیاست کا اساس قائم ہے، زبان ہی وہ میاں ہے جس سے یگانوں اور بیگانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ خود نہ ہب تک زبان کا

تبع ہی بقول شاعر

ذاتِ پاکِ تودیں ملکِ عربِ کردہ ظہور ذالِ سبب آمدہ قرآنِ بزبانِ عربی !

غرض جس طرح نطق انسان کا خاصہ ہو ویسے ہی زبان قومیت، حکومت اور مذہب کی روح رواں ہے جس طرح ایک جان دوسرا قالب اختیار نہیں کر سکتی اسی طرح کوئی قوم اپنی زبان نہیں بدل سکتی۔ بہت سی قوموں نے جو بزورِ شمشیر یا بزورِ قلم دوسری قوموں سے مغلوب ہو گئی ہیں اُس تقلید کی بنا پر جو محکوم ملتوں کی غلامی کا راز ہی یہ کوشش کی ہے کہ غالب قوم کی زبان کم بیش اختیار کر لیں لیکن ایسی سعی کا انجام ہمیشہ اُن کی تباہی ہوا ہے۔ رومانیے باوجود اس کے کہ تیغِ نصرت اُس کے ہاتھ میں تھی جب مفتوح یونان کی زبان کو اختیار کرنے میں جدوجہد شروع کی تو رومانی کی تہذیب میں انحطاط شروع ہو گیا اور علوم و فنون میں بجائے ترقی کے تنزل کے آثار نمایاں ہو گئے یہ رومانی کی خوش قسمت تھی کہ اہل رومانی نے اپنی شدید غلطی سے واقف ہو گئے ورنہ ممکن نہ تھا کہ کہ اُن کی ہستی بربادی سے محفوظ رہ سکتی۔ یورپ میں جب تک مادری زبانوں کے مقابلہ میں لاطینی کو فروغ رہا اہل یورپ علم و حقیقتی آزادی دونوں سے محروم رہے لیکن رومانی اور یورپ میں زبان میں کو رانہ تقلید کے اثر کو سیاسی آزادی نے ایک حد تک باطل کر دیا تھا۔ مگر ہمارے قبضے میں نہ قلمِ تعلیم ہے نہ سیفِ سلطنت اگر ہم اپنی زبان کی طرف سے ایسے ہی غافل رہیں جیسے کہ عام طور پر ہیں تو اس کا انجام ہماری قلمی اور یقینی قومی موت ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ زبان فاتح کی تلوار کی آواز کا نام نہیں ہے۔ فاتح اپنا خطبہ اور سکے جاری کر سکتا ہے لیکن اپنی زبان جاری نہیں کر سکتا۔ مفتوح فاتح کا مذہب اختیار کر سکتا ہے لیکن اُس کی زبان اختیار نہیں کر سکتا۔ زبان ملک اور ملت کے قلب کی حرکت کی صدا ہے۔

آج ہم میں چند لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ہندوستان اور یورپ میں تعلیم پا کر انگریزی اور دیگر السنہ مغربہ میں کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن زمانہ ان تصنیفات کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہر تصنیف ہمارے اہل ملک کی جو اردو میں نہ ہو ایک عارضی ہستی رکھتی ہے۔ ہندوستان میں آج انگریزی کا یہ زور شور ہے کہ ہندوستانی شعرا تک انگریزی میں کلام موزوں کرتے ہیں اسی طرح انگلستان میں شکسپیر اور ملٹن کے زمانہ میں لاطینی میں اگر شعر کہا جاتا تھا تو دہلی تھی اور مادری زبان میں عمدہ سے عمدہ کلام کا کوئی پُرسان نہ تھا۔ آج کوئی تباہی نہیں

کہ وہ لاطینی شاعری کہاں ہے۔ عجائب خانوں کی دائم مقفل الماریوں کے سوا ان اجزاء کا کہیں پتہ نہیں اور لاطینی الاصل اہل زبان کی رائے میں وہ کلام طالب علموں کی مشق سے زیادہ مرتبہ نہیں رکھتا لیکن ملٹن کی وہ انگریزی تصنیف جس کا معاوضہ مصنف کو بمشکل تمام میں روپیہ ملا تھا اور جس کو ہر شخص تحارت سودیکھتا تھا اب انگریزی علم ادب کی جان ہے۔ انگریزی ملت کی مہتی آج ملٹن اور شکسپیر کے کلام پر قائم ہے۔

ہندوستان میں زبان سے غفلت کا الزام تمام قوم اور ملک کے سرپرہ پر کوئی طبقہ ایسا نہیں جس کو اس بارہ میں ستشی سمجھا جائے۔ اردو کا سب سے پہلا اور بڑا دشمن ہندو مسلمانوں کا باہمی نفاق ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مادری زبان ہندی ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ اردو ہی محض الفاظ نے دونوں کو مغالہ دیا ہے۔ یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ مسلمان اردو میں ہندی الفاظ کی تعداد کو کم اور عربی اور مشکل فارسی الفاظ کی تعداد کو زیادہ کرتے جاتے ہیں اور ہندو ہندی سے سہل اور رائج عربی اور فارسی الفاظ کو خارج اور غیر مانوس اور اداق سنسکرت الفاظ کو ان کی جگہ داخل کرتے جاتے ہیں۔ اگر یہ افراط و تفریط یوں ہی جاری رہی تو اردو اور ہندی سچے سچ دو جدا اور مختلف زبانیں بن جائیں گی۔ ہندو اور مسلمانوں کو اپنی اس غلطی پر متنبہ ہونا چاہیے کیوں کہ دونوں کی یہ نادان دوستی زبان اور ملک کے حق میں عین دشمنی ہے۔ اردو کی ترقی میں دوسرا امر مانع یہ ہے کہ علما اور قدیم تعلیم یافتہ اردو کو عربی اور فارسی کے مقابل میں غیر ضروری اور کم وقعت جان کر اردو کی جانب توجہ نہیں کرتے ان بزرگوں نے جہاں اردو کو اور طریقوں سے نقصان پہنچایا ہے وہیں ایک یہ بھی ہے کہ وہ عربی عبارت ہمیشہ خلاف محاورہ اردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ قدیم مدرسہ عربیہ دہلی، دیوبند اور تمام عربی، فارسی مدارس اور مدرسین پر کتنا بڑا الزام ہے کہ آج تک کتب تفاسیر حدیث فقہ منطق فلسفہ اور ادب کی ضروری سے ضروری کتابیں بھی عام فہم محاورہ اردو میں ترجمہ نہیں ہوئیں بطیب ہندوستان میں آج تک فارسی میں نسخہ لکھتے ہیں۔

لیکن وہ گروہ جو سب سے زیادہ مورد الزام ہے جس کے افراد آنکھیں رکھتے ہیں مگر اردو پڑھنے کے لئے اندھے ہیں، کان رکھتے ہیں لیکن اردو سننے کے لئے بہرے ہیں، زبان رکھتے ہیں لیکن اردو بولنے کے لئے گونگے ہیں، جدید تعلیم یافتہ گروہ ہے۔ تمام انگریزی مدارس کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم غیر زبان میں ہوتی،

اُردو کی تعلیم پانچ سات ابتدائی جماعتوں کے بعد قطعاً بند ہو جاتی ہے علاوہ انہیں مضمون ریاضی، تواریخ، جغرافیہ، منطق، جملہ علوم کی تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ جو قوم یوں اپنی زبان سے غافل ہو وہ دنیا میں کیا فروغ پاسکتی ہے جس ملک کے لوگ اپنی مادری زبان کو پس پشت ڈال دیں اُس کی خاک سے بھلا کب کوئی فرزانہ اٹھ سکتا ہے۔ جو ملت اپنی زبان کو باعثِ ننگ اور دوسروں کی زبان کو مایہ ناز خیال کر کرے اُس میں کیا خودداری آسکتی ہے۔ یہ اپنی زبان میں تعلیم نہ پانے کا اثر ہے کہ مشہد اُسے آج تک مغربی تعلیم پانے کے باوجود کوئی قومی اور ملکی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ جاپانیوں نے صرف ستر سال کی جدید تعلیم سے یورپ کی ہم نشینی کی قابلیت حاصل کر لی ہے۔ مغرب میں عورتوں کی تعلیم کو صرف چالیس برس ہوئے ہیں۔ جو لوگ کہ اب انہما رجحانات کے لئے غیر زبان کے محتاج ہیں اور جو آئندہ اگر یہی روش قائم رہی تو اور زیادہ دستِ نگر ہوں گے وہ کیا قوم و ملت کی بنیاد ڈال سکتی ہیں اُن کی زندگی ایک تقلیدِ غلامانہ اور ایک انجذابِ گدایانہ ہوتی ضروری ہے ہندوستان کی مختلف السنہ میں جو تنایع بجا ہو رہی ہیں وہ اُردو، ہندی، بنگالی، مرہٹی، گجراتی وغیرہ زبانوں کے درمیان ہے اگر ہماری توجہ صرف انگریزی کو ”میاں مٹھو“ کی طرح حاصل کرنے میں ہی صرف ہوتی رہی تو اس جہدِ لباقی میں اُردو آخر کب تک قائم اور زندہ رہ سکتی ہے۔ ہمارے طالب علم جو ہماری آئندہ نسل ہیں جو ہندوستان اور دنیا کے اسلام کے آئندہ وارث ہیں جن سے ہماری تمام آئندہ توقعات وابستہ ہیں جب اپنی مادری زبان سے غافل ہو کر اُردو کی جانب سے پشت پھیر کر رات دن کی شہیدیت اور سخت آگ اور ظالمانہ ضربات کی مدد سے انگریزی تعلیم کی زنجیر تیار کرتے ہیں تو بالآخر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے جس وقت آخری کڑی وصل ہو جاتی ہے اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ زنجیر خود انہیں گرفت میں لئے ہوئے ہے۔

ہمارے ملک کی نئی تعلیم پائے ہوئے اہل قلم انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں، اُن کا وقت دن رات انگریزی اور مغربی علم ادب کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے، اُن کے کتب خانوں میں اُردو، فارسی اور عربی کتابوں کا وجود کیا ہے بلکہ نایاب ہے، اُن میں سے بہت کم ایسے ہیں جو اُردو ادب فارسی شاعری اور عربی علوم سے واقفیت رکھتے ہوں اور جن کو علوم مشرقیہ کی معلومات میں اضافہ کا شوق ہو گفتگو میں وہ علوم و فنون

اور حکمت کی مصطلحات پر تو کیا روزمرہ کے الفاظ تک پر قدرت نہیں رکھتے اُن کی زبان اُردو اور انگریزی الفاظ کا ایک عجیب آمیزہ ہے اُن کی تقریروں میں جس قدر ریپوریتا کا زور بڑھتا جاتا ہے انگریزی الفاظ کی تعداد میں اُس ہی نسبت اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

وہ اعلیٰ ترقی جس کے ہم آرزو مند ہیں اور وہ سچی آزادی جس کی ہم خواہش رکھتے ہیں اُردو کے کف پا کے نیچے ہے۔ زبان وطن کا کلام ہے اور وطن کا کام وطن کے کلام سے جدا نہیں جب تک طلباء کو ہندوستان میں مادری زبان میں تعلیم نہ دی جائے گی تعلیم جزو حیات بن ہی نہیں سکتی اور تا وقتیکہ اُردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا جائے گا اگر ہم میں سے ہر ایک کے سر میں ہزار دماغ ہوں تب بھی بیکار ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جدید تعلیم طوطے کی طرح آواز نکالے اور صورت پرست ہیں اور اُن کا عدم اور وجود برابر ہے بلکہ اُن کا وجود عدم سے بدرجہا ہے۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوتے تو شاید قوائے جہانی سے ہی (جن کو جدید تعلیم نے مضمل کر دیا ہے) تسلیغ بقا میں اپنی ہستی کے قایم رکھنے کے زیادہ قابل ہوتے۔

(۲)

زبان جسم ہے اور خیالات اُس کی رُوح ہیں کسی ملک کی تہذیب کی ترقی کے لئے صرف یہ ہی کافی نہیں ہے کہ مادری زبان ذریعہ تعلیم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن مضامین میں تعلیم دی جائے وہ قومی اور ملکی ضروریات کے لحاظ سے مقرر کئے گئے ہوں۔ نصاب تعلیم کوئی ترکہ نہیں ہے جو ایک نسل سے دوسری کو وراثت میں ملتا ہو بلکہ ہر قوم اور ملک کی ہر نسل کو اپنے نصاب تعلیم کو از سر نو ترتیب دینا ضروری ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اہل ملک اور اہل قوم اس سے واقف نہیں۔ قدیم درسگاہوں میں اب تک درس نظامیہ کی پابندی ہے اور جدید انگریزی مدارس اور کالجوں میں تمام علوم مشرقیہ و مغربیہ کا باہر خیال کئے جاتے ہیں۔ محض علوم مشرقیہ اور عربی کی قدیم تعلیم اس زمانہ میں کئی وجوہ سے غیر مفید اور نقصان دہ ہے۔ عربی تعلیم علوم جدیدہ کی واقفیت بغیر قوم کے حق میں بجائے آب حیات کے نہرِ ملامت اور نوش قاتل کا اثر رکھتی ہے جب تک علوم مشرقیہ کا مطالعہ مفید اور نکتہ چینی کی نگاہ سے نہ کیا جائیگا اور کھرے کو کھوٹے سے جدا نہ کیا جائیگا علوم مشرقیہ میں جدوجہد سے بجائے آزادانہ اجتہاد کے غلامانہ تقلید اور بجائے علمی ہمت کے علمی پست ہمتی پیدا ہوگی

کون نہیں جانتا کہ علوم عبریہ اور مشرقیہ کے بہت سے حصے جدید تحقیقاتوں کی رُو سے غلط ثابت ہو چکے ہیں پس جب تک طالب علم کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ غلطیاں کیا ہیں اور وہ اُن سے اجتناب کر سکے، علوم مشرقیہ کی تعلیم نیم جہالت نہیں تو کیا ہے؟ ہم ایسے سیاسی اور تمدنی حالات میں گرفتار ہیں جہاں زمانے کے ساتھ ساتھ حرکت نہ کرنا موت کا مترادف ہے جسٹس امیر علی اپنی یادگار وقت تصنیف میں فرماتے ہیں:-

”جو قوم اپنے مردہ زمانہ نامانی کو فرسودہ عبا میں ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہو اُس کے نصیب میں اُدُل ہی سے صفحہ بہشتی سے مٹنا لکھا ہے“

چوں کہ زمانہ کو محض قدیم علوم کی ضرورت نہیں یہ علوم وجہ معاش میں بھی بہت کم مدد دیتے ہیں۔ آج کل دُنیا کی نعمتوں اور ملکی اور قومی آسائش کا مدار تعلیم جدید پر ہو گیا ہے جسٹس شاہ دین مرحوم لکھتے ہیں:-

”وجاہت ظاہری لازمی ہے۔ اسلام کوئی مٹی کی مورت نہیں بلکہ یہ مجموعہ ہے مسلمانوں کی صورتوں کا اگر مسلمانوں کی صوتیں پاکیزہ ہیں، لباس عمدہ اور شاندار ہیں، چہرے ادا آ نہیں بلکہ ارغوانی ہیں، بشرہ سے آثار جاہ و جلال پائے جاتے ہیں تو اسلام کی عزت ہے اور اگر وہ پھسے حالوں میں ہیں، بھوکے پیاسے ہیں، کمزور و ناتوان ہیں اور دُنیا میں اُن کی کوئی توقیر نہیں تو اسلام کی ذلت ہے۔ دین و دُنیا کہنے کو چاہیے الگ ہوں مگر دراصل لازم و ملزوم ہیں۔ بلا ترقی دُنیاوی ممکن نہیں کہ دین میں شان و شوکت پیدا ہو سکے“

لیکن جہاں قدیم تعلیم یافتہ گروہ کا قدیم علوم کو تمام جدید تحقیقات علمی سے بالا خیال کرنا بے جا ہے وہیں جدید تعلیم یافتہ گروہ کا جدید علوم کی خواہ مخواہ پرستش کرنا بھی غلط ہے۔ جدید علوم و فنون معاذ اللہ وحی خداوندی نہیں ہیں جنہوں نے قدیم علوم کا دقت مٹا دیا ہو۔ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مغربی علوم ہی جو جدید ہیں تحصیل کئے جانے کے مستحق ہیں اور جدید کو چھوڑ کر قدیم میں وقت صرف کرنا تیض اوقات ہے اُن کو باوجود تعلیم پانے کے جاہل سمجھنا چاہیے جس مغرب کے آستانہ پر اس خیال کے لوگ شبانہ روز مسجد گزار ہیں وہ مشرق ہی کا ادنیٰ تناگر دے۔ جو بات قدیم مصری کا ہن سائس نے یونانی مُقنع سولن سے کسی ہمتی وہ نہایت سبق آموز اور ہمارے سب حال ہے:-

اہل یونان تم ہمارے سامنے بچے ہو۔ افلاطون جس پر تم کو ناز ہے ہمارے ہی مکتب کا
 فرزند ہی تھیں کے دبستان ہی میں تم سب نے تربیت پائی ہو تمہارا فیثا غورثی فلسفہ ہم ہی
 نے تم کو تعلیم کیا ہی اور تم کو جو عقل و دانش سے عاری تھے ہم ہی نے غور و فکر کے جوہر
 سے مزیں کیا ہی۔ تمہارا فلسفہ ابتلاج اور تمہارا فلسفہ غم ہمارا ہی عطا کردہ ہے ہم ہی نے
 تم کو رونا اور مہنسا سکھایا ہی۔ الف سے لے کر بتے تک جو کچھ تمہارا سرمایہ ناز ہے
 ہمارا ہی دیا ہوا ہی۔“

علم فقہ کو سب سے پہلے روم کی قدیم فقہ پر آج تمام یورپی فقہ کا اساس قائم ہے۔ روم کی مشہور و معروف فقہ کی بنیاد
 کس چیز پر قائم ہے؟ ان کے تمام قانونی ادب میں سے ہم تک صرف چند کتابیں بانڈ کٹ، گائیوس ناول،
 یسٹینان وغیرہ پہنچی ہیں اس کے مقابلہ میں اسلامی فقہ گو مذہبی مسائل سے مخلوط ہے ایک بحر ذخار ہے۔ آج
 یورپ اور ایشیا کے کتب خانے ہماری فقہ کی سینکڑوں کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں اگر روم والے دوچار
 مذاہب میں تقسیم ہیں تو ہمارے فقہ میں سو مذاہب ہیں اگر کوئی خلیفہ وقت یسٹینان کی طرح ان تمام مذاہب
 ایک نیا مدرسہ ترتیب دینے کا حکم دے تو موجودہ زمانہ کے جدید ترین قوانین سے بہتر ایک مجموعہ قانون مدون
 ہو سکتا ہی کیا عقل سلیم ہی مشورہ دیتی ہو کہ روم کی چار گنی چنی کتابوں کا مطالعہ قانونی علم حاصل کرنے کے
 لئے کافی ہے اور اسلامی فقہ کی سینکڑوں کتابوں میں سے منتخب کتابوں کا مطالعہ کافی ہے؟ کیا عقل کا یہی
 تقاضا ہے کہ مسلمان طلباء اپنے قانونی علم کی بنیاد روم کی درسیات پر رکھیں اور اسلامی کتب کو طاق نیاں پر
 ہی رہنے دیا جائے؟ روم کے قوانین کی تحقیق واجب تو ہے ہمیں کیا حاصل ہے؟ اسلامی فقہ کی چھان بین تنقید و تحقیق
 سے ہم اسلامی قوانین میں ایک تازہ روح پھونک سکتے ہیں۔

فلسفہ جس کے ساتھ ہمیشہ لفظ جدیدی زمانہ کا راہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے نہ معلوم کن معنوں میں
 نیا اور پرانا ہو سکتا ہے اور کس طرح فلسفہ مغرب کے نام سے موسوم ہو سکتا ہے۔ وحدت الوجود اور لقوت میں
 آج تک علمی مسلمانوں سے کوئی سبقت نہیں لے گیا۔ اپنشدوں کی تعلیم لافانی ہے جہاں یورپی فلسفی اگر مرک
 جاتے ہیں اور اپنے بحر کا اقرار کرتے ہیں وہاں ہندو فلسفی بے خوف محیط کی انتہا اور بسیط کی ابتدا تک

چلے جاتے ہیں۔

فنون لطیفہ میں جو قومی خصوصیات پر مبنی ہیں مغربی تقلید اگر اظہار جنون نہیں تو کیا ہی لیکن تمام ہندوستان
قدیم ساز و غما کو ترک کر کے مغربی باجوں اور گانوں پر فدا ہی۔ سرسید روموہن ٹیگور، کمار سوامی جیسے ماہرین
کی رائے سے عام طور پر واقفیت تک نہیں اُن پر عمل کجا۔ افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریت میں بیان کیا
ہو کہ غیر موسیقی کو اپنے ملک میں دخل نہ پانے دو کیوں کہ یہ رفتہ رفتہ قوانین کو درہم برہم کر دیتی ہے اور تمام
نظام قومی حتیٰ کہ آئین سلطنت کو تبدیل کر دیتی ہے اور ملت کے شیرازہ کو پر اگندہ کر دیتی ہے۔ کچھ موسیقی
پر موقوف نہیں جہاں حقیقی لذت گوش نہیں وہاں وقوف بصر بھی مفقود ہے۔ صنم بازی اور مصوری میں
ہمارے نوجوان جدید تعلیم یافتہ اُن مجسمات اور تصاویر کو دیکھ کر جو عکاسی کے درجہ سے بہت کم بھد ہیں
بے خود ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ قدیم یونانی اور جدید اطالوی احیاء کے بعد کافن جس پر وہ جان
دیتے ہیں مصر، اسپرٹیا، اور قدیم ہند کے فن کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ اختہ کے غاروں میں جو تصویریں
ہیں اور اُن میں جو رنگ ہی تمام یورپ کے نگار خانوں میں پھر جائے وہ رنگ کسی مصوّر کے موقف نے نہیں
دکھلایا۔ نٹ راجہ یا گیاتی بدھاسے مالکوں کی زہرہ کو کچھ نسبت نہیں لیکن ہمارے بہت جدید تعلیم یافتہ
جو یونانی زندگی میں زہرہ کی حیثیت سے بھی واقف نہیں اور اُس کو محض ایک بازو شکستہ عریاں عورت کی
حیثیت سے دیکھتے ہیں اُس پر غش ہیں حق یہ ہے کہ فدیث اور پالگ ناطلس، ہندوستان، مصر اور اسپرٹیا
کے قدیم اہل فن کی شگردی کا دعویٰ ہی نہیں کر سکتے۔

(۳۷)

علوم کی حالت جاہد اجسام کی سی نہیں جو ایک دوسرے کا جزو بدن نہیں ہو سکتے بلکہ پودوں کی سی
ہی جن میں باہم پوند لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے علمی احیاء کے لئے لازمی ہے کہ علوم مشرقیہ کی شلخ کنہ
میں علوم جدیدہ کی قلم لگائی جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایشیائی قدیم نقطہ نظر اور یورپی جدید نقطہ
خیال کا اجتماع سعید بن ہونا کہ ہمارے اسلاف کے علوم و فنون جو بقول مولانا مازیہ احمد خدا نخواستہ بے جا
اور مردہ نہیں ہو گئے بلکہ صرف ٹھٹھر گئے ہیں پھر تندرست اور توانا ہو جائیں یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ علوم

مشرقی کے سر جسم میں علوم مغربی کا گرم خون پہنچایا جائے۔ اس عظیم الشان مقصد کی تکمیل کا ذریعہ صرف ایک ہی اور وہ یہ ہے کہ علوم مغربیہ اور علوم مشرقیہ کا مطالعہ ہم پہلو اور ساتھ ساتھ کیا جائے تاکہ دونوں کے باہم فائدہ مطالعہ سے دونوں کے بہترین حصص خود بخود رفتہ رفتہ کجیاں ہو جائیں اور ایک نئی ہندوستانی تہذیب کی عبارت اور ترتیب کا ذریعہ ہوں۔

اگر ہم اپنی ہستی برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے فلسفہ، اپنی طب، اپنے فنون، اپنی فقہ اپنے علوم اور اپنی حکمت کو زندہ کریں اگر ہمارا ارکار رفتہ مشرقی فلسفہ مغربی فلسفہ کے اختلاط سے اپنے طب و یا بس سے پاک ہو جائے تو وہ یقیناً ہماری تعلیم کا ضروری جزو بننے کی قابلیت رکھتا ہے اگر ہمارے فنون لطیفہ (جن کی بنیاد روحانیت پر ہے) مغربی فنون لطیفہ کے اصول پر غور کے بعد وسیع تربیت و پر قیام کے جائیں تو کوئی شک نہیں کہ یورپ اور ایشیا دونوں کے موجودہ فنون سے زیادہ عظیم الشان فنون کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے۔ اگر ہم مغربی فقہ کے مطالعہ کے بعد کامل غور و خوض کو کام میں لاکر اپنی قدیم فقہ کی تنقیدی نظر سے دوبارہ تدوین کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی مثل اہل روم یا جدید اقوام کے ایک یا دو گار زمانہ جدید قانون اسلامی کے بانی نہ ہوں؟ ہمارے اسلامی اور ایشیائی علوم ہی ہماری ملت اور قومیت کی اصلی بنیاد ہیں اگر ان کا احیاء نہ ہوا تو ہم دنیا میں فقط یورپ کی ایک پڑھ و نقل بن کر رہ جائیں گے جس کی یورپ کو کوئی ضرورت نہیں اور زمانہ ہمارے نام کو مٹا دے گا لیکن اگر ہم نے علوم شرقیہ اور غربیہ کی تعلیم پہلو بہ پہلو رائج کرنے کے طریقہ کو اختیار کیا تو یقیناً بین برس کے اندر اندر ایسی تصانیف اور تحقیقاتیں ہم سے ممکن ہوں گی جن کی یورپ قد کرے گا اور جو دنیا کے علم میں اضافہ کا باعث ہوں گی۔

(۴)

قدیم علوم کی قریب قریب تمام کتابیں عربی میں ہیں جدید علوم کی کتابیں یورپ کی مختلف زبانوں میں ہیں اردو میں نہ قدیم مشرقی علوم کی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں نہ جدید مغربی علوم کی ہم بحیثیت ہندوستانی ہونے کے اپنی مادری زبان اردو میں نہ قدیم یونانی علوم کے (جن کو مسلمانوں نے اختیار کیا اور فروغ دیا تھا) اور نہ موجودہ یورپی علوم کی (جس وقت تمام دنیا کی زبانوں میں شایع ہیں) مالک ہیں۔

بعض اشخاص ایک نہایت غلط دلیل عربی کو قدیم علوم اور انگریزی کو جدید علوم کے حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دینے کے متعلق یہ دیتے ہیں کہ ہر علم کو اُس کی مخصوص زبان میں حاصل کرنا چاہیئے۔ اُن کی رائے میں جو مضامین عربی کتابوں میں ہیں وہ عربی ہی میں مطالعہ ہو سکتے ہیں اور جو انگریزی کتابوں میں ہیں وہ انگریزی ہی میں پڑھائے جاسکتے ہیں لیکن یہ خیال غلط ہی۔ علم ہرگز جغرافی سرحدوں سے محصور نہیں ہے۔ ہر زبان کی مثال ایک خارجی ظرف کی سی ہے اور علم جو مخروط کی کسی خاص طرف کا پابند نہیں جیسے پانی کو جس وقت چاہیں ایک برتن سے دوسرے میں منتقل کر سکتے ہیں بعینہ اسی طرح ہر علم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر سکتے ہیں اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ علوم کا مطالعہ اصل زبانوں میں کرنا چاہیئے تو علوم جدیدہ کی ہر شاخ کے جاننے کے لئے ضروری ہو گا کہ یورپ کی کم از کم سات زبانوں سے واقفیت ہو۔ فی زمانہ کسی جدید معرکہ الاراجعت کو لے لیجئے خواہ وہ فلسفہ میں ہو یا حکمت میں کسی جدید مسئلہ پر غور فرمائیے خواہ علوم سے متعلق ہو یا فنون سے کسی جدید اصول یا اکتشاف یا اختراع پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ کوئی مغربی ملک ایسا نہیں ہے جہاں متعدد ماہرین نے اُس کے متعلق نہ لکھا ہو اور اپنی معلومات سے اُس میں اضافہ نہ کیا ہو اس لئے فی زمانہ ہر مضمون سے ایک یا دو چار مغربی زبانیں جاننے پر بھی واقفیت محض ناممکن اور قطعی محال ہے جب تک زیادہ تر تراجم سے کام نہ لیا جائے۔

آج مغرب میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جہاں تعلیم و تربیت کا ذریعہ تراجم اور فقط تراجم نہ ہوں علوم صحیحہ کی تعلیم بغیر تراجم ہو ہی نہیں سکتی علم اور حکمت کی کوئی شاخ ایسی نہیں ہے جس کے مطالعہ کے لئے تراجم کی جستجاء نہ ہو اگر کوئی شخص آج اصل زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر بطور مثال صرف جدید فلسفہ سے واقف ہونا چاہے تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم بیکتن، برڈو وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصل تصانیف لاطینی میں ہیں، دے کار، کامت، بوٹو وغیرہ واقف ہو جن کی اصل تصانیف فرانسیسی میں ہیں کانت، ہسٹکل، فٹے، شلیگل، لٹے وغیرہ واقف ہو جن کی اصل تصانیف جرمن میں ہیں۔ اسی توڑ سے واقف ہو جس کی اصل تصانیف پنج زبان میں ہیں کروپے وغیرہ واقف ہو جن کی اصل تصانیف اطالوی زبان میں ہیں وٹلی ہالیاس۔ تمام جدید فلسفہ سوائے برٹکے، مل، اسپنسر وغیرہ کے غیر انگریزی یورپی زبانوں میں ہی اگر صرف

اصل زبان کو ذریعہ تسلیم بنانے کی کوشش کی جائے تو علمی دُنیا میں قیامت برپا ہو جائے اور تمام علمی تحقیقات میں ایک دن میں بند ہو جائیں۔

علوم و فنون کی اُن کتابوں میں جو ادب اور معانی سے تعلق نہیں رکھتیں قریب قریب جملہ مضامین میں ترجمہ اور اصل کتاب میں کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ میں یہ کہوں گا کہ چونکہ مصنفین باہرین ہوتے ہیں اور تمام عمر ایک مضمون کی تکمیل میں صرف کر دینے کے باعث ادب کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں رکھتے اپنے مطالب کو فصاحت اور بلاغت سے اکثر بیان نہیں کر سکتے اور مترجم جو عموماً ادیب ہوتے ہیں اپنے ترجمہ کو اصل کے ان اسقام سے پاک کر دیتے ہیں اور ترجمے بعض اوقات اصل سے بہتر ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ علمی حالت خود اس امر کی متقاضی ہے کہ اہل قلم ترجمہ کے کام کی طرف توجہ کریں۔ ہر ایک قوم کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب تاریخی اور سیاسی اعتبار سے علوم و فنون کی روشنی کم ہو جاتی ہے اور اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے چراغ کو اور اقوام کے چراغ سے روشن کرے۔ اس زمانہ میں آفریقہ کی قوت زائل ہو جاتی ہے جو تصنیفات ہوتی ہیں وہ ادنیٰ درجہ سے آگے نہیں جاتیں الا ماشاء اللہ عوام کا مذاق درست نہیں رہتا ایسے زمانہ میں ضروری ہے کہ کتابوں کے لکھنے والے بجائے اس کے کہ خود اپنے خام یا نیم نچتہ خیالات کا اظہار کریں دُنیا کے گذشتہ اور موجودہ مصنفین کے ترجمان ہو جائیں۔ گو ہم میں ہر شخص اس بات کا مشتاق ہے کہ وہ خود مصنف ہو اور مترجم یا مؤلف ہونا اپنی کسرِ شان تصور کرتا ہے مگر یہ خیال غلطی پر مبنی ہے آج یورپ میں مترجم بھی وہی پایہ اور درجہ رکھتے ہیں جو خود مصنف رکھتے ہیں انگریزوں میں ولیم آچر موجودہ مشہور نقاد اور ادیب کی شہرت اس بنا پر قائم ہے اور ہمیشہ رہے گی کہ وہ افسانہ نویس کے ڈراما نویس کا مترجم ہے۔ رکرٹ جس نے دیوانِ حماسہ کا ترجمہ کیا ہے، شعرا و جرمنی میں ممتاز پایہ رکھتا ہے۔ استیفان گیارگے المانی شاعر سون برن کا مترجم ہونے کی حیثیت سے معروف ہے۔ ہمارے ملک میں جو حالت آج ہے وہ اس امر کو چاہتی ہے کہ ترجمہ اور تالیف کو تصانیف پر ترجیح دی جائے۔ سوائے معدودے چند لوگوں کے جن کو قدرت نے اعلیٰ ترین دماغوں سے فرین کیا ہے اور اپنے خاص پیغام پہنچانے کے لئے مقرر فرمایا ہے ہمارے ملک و قوم کے بیشتر لوگوں کو چاہیے کہ مشرقی اور مغربی

زبانوں سے ترجمہ کی جانب توجہ کریں۔

جن لوگوں نے ترجمہ کے کام کو کیا ہر اُن کو یہ شکایت ہو کہ مصطلحات کی تلاش اور ایجاد میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ میری رائے میں یہ اشکال خود ہی ترجمہ کے کام کو زیادہ قابلِ عزت اور وقعت بنا دیتا ہے کیوں کہ اس قسم کی مشکلات کو حل کر کے مترجم زبان کی عمارت کے اساس کو قائم کرتا ہے اور آئندہ نسلوں کے واسطے زبان کی ترقی کے راستہ کو صاف کرتا ہے۔

مصطلحاتِ علمیہ کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ اُن کے انتخاب یا وضع کرنے والے ماہرین ہونے چاہئیں یعنی جس علم و فن کی مصطلحات مطلوب ہوں اُن کو اُس ہی علم یا فن کے ماہرین بنائیں لیکن یہ درست نہیں ہمارے اکثر انگریزی یونیورسٹیوں کے ہندوستانی پروفیسر جو علوم جدیدہ کی تعلیم دیتے ہیں اپنی زبان پر مصطلحات سے بہت کم واقف ہیں بلکہ خود انگریزی زبان میں بھی علم اللسان کے نکتہ نظر سے یونانی اور لاطینی مصطلحات کے معنی نہیں جانتے۔ جدید علوم و فنون کی مصطلحات اور علمی لغات یورپ کی زبانوں میں زیادہ تر لاطینی اور یونانی الفاظ سے مرکب ہیں اور ہماری زبان میں عربی یا فارسی یا ہندی لریج ہو سکتی ہیں حاصلِ کلام اردو زبان کی اس خدمت کے لئے ایک ایسی جماعت کے تیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں ماہرین کے علاوہ عربی، فارسی، یونانی، لاطینی، انگریزی، فرینچ اور جرمن کے جاننے والے موجود ہوں بعض مشرقی اقوام نے جن میں ترکوں کی مثال پیش کرتا ہوں انگریزوں کی طرح بہت سی جدید مصطلحاتِ علمیہ کو (مثلاً آکسیجن ہائیڈروجن وغیرہ) ویسے کا ویسا ہی اپنی زبان میں لے لیا ہے یہ محض اُن کی سہولت اور نارسائی کی دلیل ہے انگریز تو یونانی اور لاطینی مصطلحات کو اختیار کر چکے اور وہ اُن کی زبان کا جزو ہیں لیکن ہمارے لئے ابھی انتخاب کا موقع باقی ہے ایسی صورت میں جب کہ یہ بات یکساں ہمارے بس میں ہے کہ چاہیں تو یونانی اور لاطینی الفاظ اور مصطلحات کو لے لیں اور چاہیں تو خود اپنی زبان میں ترجمہ کر لیں ہمارے انگریزوں کی تقلید کرنا سخت غلطی ہو گا۔ جرمنوں نے جو علمی حیثیت سے ایک نئی قوم ہیں ایسا نہیں کیا بلکہ سب مصطلحات کو اپنی زبان میں ترجمہ کر لیا ہے۔

ہم کو چاہیے کہ تمام علوم و فنون کی مصطلحات کو اپنی قدیم اردو فارسی اور عربی زبانوں کی کتابوں میں

تلاش کریں بہت سے علمی لغات موجود ہیں مگر پُرانی کتابوں میں دبے پڑے ہیں ان بے ہاموتیوں کو اُن تاریک گہائیوں میں نئے نکالنا چاہیے سائنس کی مصطلحات بھی بہت سی موجود ہیں صرف اُن کو تلاش کر کے رواج دینے کی ضرورت ہے۔ نباتیات کی بہت سی مصطلحات میزان الادویہ میں مل سکتی ہیں۔ کیوں کہ ہماری طب کی تقریباً تمام ادویہ نباتی ہیں اگر الفاظ نہ مل سکیں تو اُن کو خود بنانے کی کوشش کرنی چاہیے اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انگریزی یا جس یورپی زبان کا لفظ ہو اُس کے اجزاء کی تحلیل کر لینی چاہیے اور پھر اُس کے لاطینی یا یونانی وغیرہ مادہ کے لحاظ سے اُس کا ترجمہ کرنا چاہیے۔

۹۸.۱۲

مثالیں

graph	Phono	Phono-graph
نگار	آواز	
phone	Tele	Tele-phone
فون	دور	
spread	Fern	Fernsprecher (جرمنی میں اسی لحاظ سے)
گسترے	دور	
mobile	Auto	Auto-mobile
مرواں	خود	
scope	Tele	Telescope (پہلے سے موجود ہے)
بین	دور	

پس کام اتنا مشکل نہیں جیسا نظر آتا ہے۔

ترجمہ کرنے میں تین مختلف طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں ایک یہ کہ عربی دوسرے یہ کہ فارسی تیسرے یہ کہ ہندی مصطلحات وضع کی جائیں۔ عربی الفاظ کو ترجیح دینے والے یہ وجوہ پیش کرتے ہیں کہ عربی زبان میں تمام علوم و فنون کی مصطلحات موجود ہیں جو صرف مردِ زمانہ سے غیر مستعمل ہو گئی ہیں اُن کو تلاش کر کے دوبارہ زندہ کرنا کافی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے دس بارہ برس میں علوم قدیمہ اوجید یہ وہیں اتصال پیدا ہو جائے گا علاوہ ازیں اہل بیروت اور اہل مصر نے جو جدید مصطلحات وضع کر لی ہیں وہ ہمارے کام آ سکتی ہیں اور بہت سی محنت بچ سکتی ہے لیکن میری رائے میں اردو کے لئے جس طرح انگریزی لاطینی یا یونانی مصطلحات

کا اختیار کرنا غلط ہی عربی مصطلحات کا اختیار کرنا بھی درست نہیں۔ عربی مصطلحات کے اختیار کرنے سے وہی قباحت جو انگریزوں کو نا پسندینی مصطلحات کی وجہ سے عارض ہو باقی رہتی ہے اور وہ آسانی جو ہر منوں کو خاص ہر من مصطلحات سے حاصل ہو پیدا نہیں ہوتی لغات علمیہ کی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص اُن کو آسانی سمجھ لے اگر اُردو میں ایسی مصطلحات کو رواج دیا جائے جن کا مفہوم پانے کے لئے اَوّل عربی زبان کا سیکھنا لازم ہو تو یہ لغات کسی طرح ہماری زبان اور ہمارے ملک کے لئے آموزوں نہیں ہو سکتے۔ عربی لغات اختیار کرنے میں یہ مشکل ہے کہ وہ عام فہم نہیں میں دریافت کرتا ہوں کہ کون شخص ایسا ہو جو عربی زبان جانے بغیر ذیل کے الفاظ کے معنی سمجھ سکتا ہے۔

کثیرۃ الرجل - اخطبوطیہ - شوکیۃ الجلد - مستعلج الجلد - سلجینیہ - مستقیم الاجنحہ - اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ انگریزی مصطلحات ہی بحسبہ اختیار کر لی جائیں کیوں کہ گویا کتنا کوئی فخر کا باعث نہیں لیکن ہمارے ملک کے لوگ انگریزی مصطلحات سے کم از کم ان عربی مصطلحات کی نسبت زیادہ واقف ہیں۔ ہندی الفاظ اور مصطلحات اختیار کرنے میں یہ وقت ہے کہ لطافت زبان بالکل جاتی رہتی ہے۔

مثال

ہندی لفظ

روکڑ

سرمایہ

Capital

ایک منطق کے رسالہ میں

Contrary

Contradictory

کا ترجمہ

نقص تفصیلی

نقص اجمالی

آدھا توڑا اور پورا توڑ کیا گیا ہے۔

میری رائے میں فارسی زبان کو اس بارہ میں عربی اور ہندی زبانوں پر ترجیح ہے۔ میرا ناچیز خیال یہ ہے کہ ہم کو افراط اور تفریط سے بچنا چاہیئے اور سب سے اَوّل جہاں فارسی مصطلحات موزوں بن سکیں اُن کو سب پر ترجیح دینی چاہیئے اس کے بعد عربی قدیم مصطلحات کو جو مفرد یا مانوس الاستعمال الفاظ کی صورت میں ہوں اختیار کرنا چاہیئے ایسے الفاظ سے جو ہمازی زبان کے لحاظ سے سخت یا وزنی ہوں اجتناب کرنا چاہیئے۔ فارسی زبان کو

مصطلحات وضع کرنے کے لحاظ سے جو خاص موزونیت حاصل ہو اس کو نہایت آسانی سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔
 ادھر جو عربی مصطلحات کی مثالیں بیان ہوئی ہیں اگر ان کی بجائے فارسی مصطلحات وضع کی جائیں تو فارسی
 کی فوقیت عربی پر خود بخود عیاں ہو جائے گی کون ایسا شخص ہے جو مفصلہ ذیل مصطلحات کے معنی نہیں سمجھ سکتا؟
 کثیر بابا - خاریت - گدازجلہ - غلاف پوش - راست پر - فارسی زبان میں جرمن کی طرح یہ خوبی ہے
 کہ جن دو لفظوں کو چاہیے فوراً ملا کر مرکب لفظ بنالے جسے مصطلحات کے لئے ایسی زبان سے زیادہ موزوں
 ہے عربی میں یہ بات نہیں ہماری زبان میں عربی مصطلحات ذرا ثقیل بھی معلوم ہوتی ہیں۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ آیا مصطلحات کی لغت پہلے تیار ہونی چاہیے یا پہلے مختلف مضامین کی کتابیں
 لکھی جائیں اور ان میں حسب ضرورت مصطلحات وضع کر کے داخل کی جائیں اور پھر جب رفتہ رفتہ اس میں ترقی
 ہو تو تمام مصطلحات کو یکجا جمع کر کے لغت تیار کی جائے لغت کی تقدیم کے مخالفین کہتے ہیں کہ اگر لغت پہلے
 سے تیار ہوئی تو وہ ناقص ہوگی اور اس طرح ناقص مصطلحات رواج پا جائیں گی بدیں وجہ لغت میں صرف اخصر
 الفاظ کو جگہ دینی چاہیے جو وقت کی کوئی پرسکے جانے کے بعد مقبول عام ہو جائیں میں اس تقدیم اور تاخیر کا
 قائل نہیں لغت کوئی زبان کی محکمال نہ ہوگی کہ اس کی تدوین کے بعد مصنفوں مولفوں اور مترجموں کو کوئی
 مصطلحات جو محکمال باہر ہوں لکھنے کی اجازت نہ ہوگی اور جو لفظ لغت میں جن معنی میں استعمال ہوگا اس کو
 سب کو قبول کرنا پڑے گا۔ ایسا خیال درست نہیں جو انخاص اس وقت ایسی لغت ترتیب دے رہے ہیں ان کا
 منشا صرف اتنا ہے کہ وہ مصنفوں مولفوں یا مترجموں کی امداد کی غرض سے اپنی لغت میں امتحان اور آزمائش
 کے لئے الفاظ پیش کریں اور مصنف مولف اور مترجم ان کی محنت سے مستفید ہوں ان مصطلحات کی پابندی
 کسی پر لازمی نہ ہوگی بلکہ مصنفین مولفین اور مترجمین کا فرض ہوگا کہ وہ مصطلحات مندرجہ لغت میں اصلاح
 ترمیم اور قطع و برید کرتے رہیں یوں یہ کتاب لغت حقیقت میں ایک ابتدائی خاکہ ہوگی اور مذاق سلیم رکھنے والے
 اہل قلم اس کے مندرجہ الفاظ میں برابر رد و بدل کرتے رہیں گے اگر اسی طرح دونوں فریق ایک دوسرے
 کے میسر اور معاون رہیں تو دس بارہ برس میں ایک مستند لغت بھی تیار ہو جائے گی اور وہ وقت آجائے گا
 کہ الفاظ کے معنی کو مقرر کر دیا جائے۔

اکثر یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ جدید مصطلحات کی لغت کی کتابیں ترکی عربی فارسی میں موجود ہیں یا نہیں؟ میں نے اس کے متعلق جہاں تک واقفیت ہم پہنچائی ہو وہ یہ ہے کہ سلسلہء اع میں طہران میں ایک کتاب فرانسیسی زبان میں شائع کی گئی ہے جس میں علم الانسان اور طب مغربی کی مصطلحات فرانسیسی - انگریزی المانی اور فارسی میں درج ہیں اس کے علاوہ فارسی زبان میں جدید مصطلحات کی کوئی لغت نہیں عربی میں بیروت میں چند کتابیں طبع ہوئی ہیں لوئس معلوف نے ایک لغت عربی الموسوم بہ المنجد سلسلہء اع میں شائع کی ہے اس میں الفاظ کے معنی عربی سے عربی میں درج ہیں اور ساتھ ساتھ اور ٹیکنیکل مصطلحات بھی شامل ہیں۔ ایک اور مفید لغت جس میں بعض انگریزی مصطلحات کے عربی مرادف الفاظ موجود ہیں ابکاریور سلسلہء اع کی ہے۔

مصر میں ایک لغت اسپیرو کی ہے جو قاہرہ سے سلسلہء اع میں شائع ہوئی ہے پرنسٹن کالج بیروت نے جدید علوم کی مختلف شاخوں پر تیس چالیس برس کا عرصہ ہوا ابتدائی کتب لکھوائی ہیں ان سے بھی مدد مل سکتی ہے لیکن بہت کم۔

دائرة المعارف البستانی بھی اس نکتہ نظر سے قابل توجہ ہے۔ پرانی کتابوں میں الخوارزمی کی مفاتیح العلوم اور ایسی ہی بیسیوں کتابیں لائق غور ہیں ان میں سے بہت سے مصطلحات تلاش ہو سکتی ہیں جن کو رواج دنیا ممکن ہے۔ ایک اور کتاب جس کی تعریف میں نے سنی ہے اور جو غالباً ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال میں موجود ہے۔

*A dictionary of the Technical terms
used in the sciences of the Mohammedans.*

ناگری پرچاری سمجھا اور گروکل ہر دو ار کی کتابیں اور درسیات بھی توجہ کے لائق ہیں۔

اے غالباً ڈاکٹر صاحب مرحوم کی مراد فاضل تھانوی کی کتاب ہے۔ (ادیٹر)

بنگالی زبان پر مسلمانوں کے احسانات

(از جناب حامد جمال صاحب سابق مدیر مسأوات مرحوم)

جناب حامد جمال صاحب نے ہندوستان کے نامور نغمہ سنج ڈاکٹر راہندر ناتھ ٹیگور کی تصانیف سے ایک اچھا انتخاب کر کے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس پر انھوں نے ایک مقدمہ لکھا ہے اور شرع کے کلام پر تفتیشی نظر ڈالی ہے۔ اس پر بیابچہ کا ایک حصہ یہ مضمون ہے۔ یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ چونکہ اس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے بڑی تحقیق سے کام لیا ہے اور بنگالی زبان سے مسلمانوں کا جو تعلق ہے اُسے ایسی خوبی اور وضاحت سے بیان کیا ہے جو اب تک کسی نے بیان نہیں کیا تھا، اس لئے میں نے اردو میں اس کا شائع کرنا مناسب سمجھا۔

مضمون درحقیقت پڑھنے اور داد دینے کے قابل ہے۔ اڈیٹر

بنگالی زبان قدیم پراکرت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ پراکرت کے قواعد اب بھی اس زبان میں مرعج ہیں۔ ہندو کے پیروں نے دسویں صدی کے آخر میں اس زبان کو جو اُس وقت گوڈا پراکرت کہلاتی تھی ادبی شان دینی چاہی اور اس زبان میں کتابیں تصنیف کرنی شروع کیں مگر ہندوؤں کے دَوْر دَوْرے میں یہ پس کر رہ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں کا فلسفہ نفرت ہی ان کی لقب کا اہم راز ہے۔

منوجن کے جغرافیہ کے مطابق بنگال آریہ ورت کا ایک حصہ تھا اپنی ہم مذہبوں کو اس صوبے سے الگ کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور یہاں کے لوگوں سے تعلقات قائم رکھنے کی ممانعت۔ اننت تر تھانے اس ملک کو راکشوں کا دیس کہا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ یہاں کے باشندے مگدھ کی نسل سے تھے اور برہمنوں کا زور بہت دونوں ملک پر چل نہ سکا اور نہ ان کی سنسکرت کو کوئی عروج حاصل ہوا۔ کرشن پنڈت نے جو بارہویں صدی میں گزرا ہے

لے گوڈا بنگال کو کہتے ہیں

گودا پر اُکرت کو بموتوں کی زبان قرار دیا ہے۔ ہندوؤں نے اس زبان کی مکمل بربادی کا ہتھیہ کر لیا تھا اور اس کو
میا میٹ کر چکے تھے جس کے ثبوت میں سنسکرت کا یہ مشہور قطعہ کافی ہے۔

”جو شخص اٹھارہ پرانوں یا رامین کی دستاؤں کو بنگالی زبان میں بیان ہوتے سنتا ہے

وہ بدترین دوزخ میں جھونکا جائے گا“

اس صورت میں کس کو اُمید و ہوم بھی ہو سکتی تھی کہ یہ زبان زندہ بچگی اور سرسبز ہوگی؟ اس لئے کہ علاوہ
برہمنوں کی دشمنی کے یہ راجاؤں ہمارا راجاؤں کی سرپرستی سے بھی محروم تھی اور تمام درباروں میں وکرماجیت کی
وقت سے یہ قاعدہ چلا آ رہا تھا کہ سنسکرت کے ناظم و ناثر زینت دیا رہا ہوتے تھے۔ مگر انسانی قوت قدرت کی
مشیت میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی۔ وہ زبان جو گلی کوچہ کی عامیانہ زبان ہو کر رہ گئی تھی اس کی اعانت مسلمانوں
کے سپرد کی گئی اور انھیں کے ہاتھوں یہ اس قدر عروج کو پہنچی کہ دورِ حاضر میں اہل علم جرمنی سے اس کے مشاق ہو کر
آئے۔ مسلمان چوں کہ دلوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے اس لئے جب تک وہ فاتحانہ مغائرت کو دور نہ کرتے یہ
مقصد نہیں حاصل ہو سکتا تھا اس کے لئے لازم تھا کہ وہ یہاں کے باشندوں کی زبان سیکھیں اس کی قدر افزائی کریں
تاکہ رعایا کے رسم و رواج اور جذبات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے ہندو مذہب کی دونوں مشہور
اور مبرک کتابوں کا ترجمہ بنگالی زبان میں کرایا۔ اور اس کا سہرا ناصر شاہ کے سر ہی جس کی شان میں شاعر و دیپتی
نے جس نے سلطان غیاث الدین کی بھی بہت تعریف کی ہے۔ متعدد تصدیع کئے ہیں اور اس کی عدل گتری اور رعایا
پر دردی کی تعریف کرتے ہوئے اس کو محبت کا دیوتا قرار دیا ہے۔ یہ نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے مگر اس کا
حوالہ دوسرے ترجمہ میں جو حسین شاہ کے عہد میں ہوا متعدد جگہ آیا ہے حسین شاہ بنگالی زبان کا بڑا دلدادہ تھا
اس نے اپنے معزز درباری ملا و ہرواسو کو بھاگوت کا بنگالی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا جس کے دو باب تیار ہو جانے
پر سلطان نے اس کو کُن راج خان کا خطاب عطا فرمایا۔ حسین شاہ نے اپنے جنرل پیر گل خاں کو رز چٹیا کا محکمہ کے
تحت میں مہابھارت کا ترجمہ کرایا۔ کوئٹہ پر میٹور جس سے پیر گل خاں نے مہابھارت کا ترجمہ کرایا حسین شاہ کی
تعریف میں یوں گویا ہوتا ہے۔

”بادشاہ ایک روشن دماغ اور ادوار العزم آدمی تھا۔ پانچوں لکھو دھڑ کے لوگ اس کی تعریف میں
لے سوار تھیں پنجاب کیا کو جابلی قبیح۔ گو دینی بنگال مٹھیا لایمی درینگا۔ اور اٹکا لایمی اور یہ۔ یہ سب مل کر پانچ لکھو دھڑ کے لوگ ہیں

طب اللسان تھے۔ وہ فنِ سپہگرمی کا ماہر اور کلجک میں شل دوسرے کرشن کے تھا۔
 سری کرن نندی جس نے پیر گل خاں کے وفات کے بعد بقیہ حصہ مہا بھارت کا ترجمہ کیا حسین شاہ کے
 بارے میں یوں کہتا ہے:-

”حسین شاہ ایک زبردست بادشاہ تھا اور شل دوسرے رام کے سلطنت کرتا تھا۔ وہ دنیا پر
 صلح و آشتی، سلوک اور سزا اور اپنے دشمنوں میں تفرقہ اندازی سے حکومت کرتا تھا۔“
 سری کرن نندی نے ایک دوسرے مقام پر چھوٹے خاں ولد پیر گل خاں کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے
 ”وہ جنگ کے وقت سپہرا ہوا شیر ہے۔ وہ مثل ہاتھی کے نہایت وقار سے چلتا ہے۔ اس میں سنبھ
 اوصاف ہیں اور خدا نے اس کو عالمگیر شہرت دی ہے۔ بلند خیالی اور سخاوت میں وہ دلی اور کرن
 کا مقابلہ کرتا ہے۔ فنِ سپہگرمی اور قوت بازی میں اس کا کوئی شل نہیں ہے۔“

رامائن کا سب سے عمدہ ترجمہ کرتا تو اس نے کیا ہے اور اس کی مقبولیت کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ پانچویں برس
 بعد بھی آج ہر سال اس کی لاکھوں کاپیاں بنگال میں فروخت ہوتی ہیں۔ کرتا تو اس نے اپنی زندگی کے نہایت
 مختصر حالات چھوڑے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس نے کہیں اپنے اس مربی بادشاہ کا نام نہیں لکھا ہے جس کے
 حکم سے اس نے رامائن کا ترجمہ کیا اور جس کی قدرا فرائی سوز اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ وہ اپنے تذکرہ
 میں لکھتا ہے:-

”اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد میں گود کے بادشاہ کے دربار میں حاضری کا طالب ہوا اور پانچ اشعار
 اس کی خدمت میں رکھ بھیجے۔ میری درخواست منظور ہوئی اور بادشاہ نے مجھ کو باریاب کیا۔
 بادشاہ کا دربار شل دیوتاؤں کے سہما کے منور تھا اور میں اس منظر کو دیکھ کر شہزادہ گیا بادشا
 خوش و خرم تھا اور سر برآوردہ لوگ اس کے گرد کھڑے تھے۔ محل کے مختلف حصوں میں پانچ
 گانا ہو رہا تھا اور لوگ تیزی سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ صحن میں سُرخ قالین بچھا تھا اور
 اور اس پر ایک خالیچہ پڑا تھا۔ خوبصورت ریشمی شامیانے کے نیچے بادشاہ مانگہ کے مینے کی
 ہلکی دھوپ کا لطف اٹھا رہا تھا۔ میں بادشاہ سے فاصلہ پر بھاگھڑا ہوا لیکن بادشاہ نے مجھے

قریب آنے کا حکم دیا۔ میں نے سات اشعار سن کر تین میں منائے۔ بادشاہ نے غور سے سنا اور بہت محظوظ ہوا۔ کد آرخاں نے میرے اوپر گلاب چھڑکا اور بادشاہ نے مجھے خلعت سے سرفراز کیا۔ اس نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ اس شاعر کو کون سا انعام دینا زیادہ مناسب ہوگا؟ انھوں نے عرض کیا کہ جو حضور کی مرضی ہو حضور کی اس قدر عزت افزائی ہی سب سے بڑا انعام ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں کسی انعام کا طالب نہیں ہوں بلکہ اپنے کلام کی سچی داد کا۔ بادشاہ نے میرے اس جواب کو بہت پسند کیا اور مجھ کو رمان کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ جب میں دربار سے باہر نکلا تو لوگ اضطرابِ شوق سے میری طرف بڑھے اور مجھے اپنے وقت کا دایمگی کہنے لگے۔

یہ باتیں صاف ظاہر کر رہی ہیں کہ یہ دربار کوئی مسلم دربار تھا۔ کد آرخاں کی موجودگی اور بادشاہ کا خلعت عطا فرمانا اور اس کے بعد تمام درباریوں سے استفسار کرنا کہ کون سا انعام اس کے حسبِ حال ہوگا کافی ثبوت اس بات کے ہیں کہ بادشاہ کوئی مسلمان بادشاہ تھا اس لئے کہ کوئی ہندو راجہ کسی دوسرا مہتمی کے انعام دینے میں کبھی نہ جھجکتا اور نہ اپنے وزیروں سے ایسا سوال کرتا اس لئے کہ وہ ہندو رسم و رواج سے واقف ہوتا۔ غرض مسلمانوں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی سے تاریخ بھری بڑی ہی اور پرانی بنگالی کتابیں ایسے اذکار سے پُر ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

جب شفقت کی سُرخی سونا خرا کی بلند چوٹیوں کے سرسبز گھنے درختوں میں پوشش ہو جاتی تھی پیر گل خاں اپنے درباریوں کو محل میں طلب کرتا تھا۔ اس وقت مہابھارت کا مترجم معزز درباریوں کے سامنے اپنا ترجمہ سنا تھا اور دلچسپ اور پر لطف قطععات کی گورنر خود داد دیتا تھا۔ شاعر اپنے مرنے کو کھجنگ میں تھری کا تومار کتنا تھا اور انتہائے لطف و کرم یہ تھا کہ صاحبِ تخت باوجود مسلمان ہونے کے جس کے لئے ایسے الفاظ سخت تو ہیں آئینہ تہمتے کشادہ پیشانی سے ایسے خطابات کو قبول فرماتا تھا اور شاعر کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

مسلمانوں کی کس نسیان پر وہی کا یہ اثر ہوا کہ ہندو راجاؤں نے بھی اب مسلم تقلید میں بنگالی شعرا کو اپنے دربار میں جگہ دینی شروع کی بہرہمنوں کے بنائے کچھ نہ بنی اور یہ زبان یو ما فیو ما بڑتی کرنے لگی۔ گرو فارسی کے

فاتحانہ اثر سے یہ بری نہ رہ سکی اور یہ لازمی نتیجہ تھا۔ بنگالی زبان میں فارسی الفاظ تو اسی وقت شامل ہو گئے تھے جب مسلم لوگوں کا حملہ شروع ہوا تھا۔ ۱۲۳۷ء تک بہت سے الفاظ بنگالی زبان کے مردہ ہو گئے تھے اور ان کے بجائے فارسی الفاظ مستعمل ہونے لگے تھے۔ مثلاً بجائے دھرمادھیکر کے لوگ قاضی کہتے تھے بجائے شانت کے کو تو ال بجائے پتر کے وزیر اور بجائے شینا کے پیک۔ مگر گو شہر۔ لٹکا کو خزانہ۔ بھومی کو زمین بھویا کو زمیندار۔ اتھا لٹکا کو عمارت وغیرہ وغیرہ لوگ بولنے لگے تھے۔ مگر بنگالی شاعری کو اس وقت تک عروج حاصل نہ ہو سکا جب تک کہ مسلمانوں کے تمدن کا کافی اثر نہ پڑ لیا۔ ان کے قبل کی شاعری صرف فہرستی شاعری تھی جس کو عام طور پر گنوار گایا کرتے تھے اور جو تخیل سے محروم، مناظر فطرت اور جذبہ انسانی سے بالکل بے بہرہ تھی۔

چودھویں صدی میں مسلمانوں کا پورا اثر پڑ چکا تھا اور اس صدی میں یہاں کے لوگوں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس نے یہاں کی شاعری کو بہت زیادہ وسعت دی اور اس میں ایک نئی روح پھونکی اس جماعت نے عورت کی پرستش کو تکمیل روح کا سب سے اول اور اتم ذریعہ قرار دیا۔ اس کو پر اکپاس یا دھوراکر کہتے ہیں۔ یہ طریقہ بدھ مذہب کے سہا جیہ طرز تعلیم سے ملتا جلتا ہے۔ یہاں کے لوگوں پر بدھ مذہب کا جس قدر اثر تھا ظاہر ہے۔ اب فلسفہ عشق مجازی اور مسلم عشاق کی داستانوں نے ان جذبات کو بھر جانے میں دامن کا کام کیا۔ بنگال میں ایسے عقیدہ کا زور پکڑنا بہت ہی عجیب انگیز معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ یہاں کے تمدن کا فوٹو ایک شاعریوں کی چینیچٹا ہے۔

”آفتاب کی کرنیں ہماری پردہ نشینوں کو نہیں چھو سکتیں اور آفتاب ان غیر تان ماہ کے روپڑ نہیں آسکتا“

جس ملک کا یہ تمدن ہو اور جہاں کے دروازے اس سختی سے غیروں کے لئے بند ہوں وہاں اس عقیدہ کا پھیلنا اور ترقی کرنا محال معلوم ہوتا ہے۔ مگر جس طرح دیگر مقامات پر بھی سوسائٹی کے قوانین جذبہ کے ہواؤ کو نہیں روک سکے یہاں بھی اس تشق کی نہر نے مذہبی اور اخلاقی دیواروں کو منہدم کر کے ایک سیلاب عظیم برپا کر دیا۔ چاندی دس اس دور کا قیس گذر رہی اور اپنے گرم جذبات سے اس نے اس تحریک میں ایک

نئی رُوح پھونکی ہو۔ مشرقی بنگال میں اب تک وارنٹگوں کو مجنون چاندی کہتے ہیں۔ چاندی داس ایک دھوبن راسمی نامی پر عاشق ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کڈتات کر دیا گیا۔ اس کے بھائی نکوٹالانے جو ایک ذی اثر برہمن تھا اپنے ذات والوں کی بڑی خوش مکر کے اُن کو اس بات پر راضی کیا کہ اگر چاندی داس اپنی اس رزاکت کی حرکت سے باز آئے اور راسمی کے عشق سے دست بردار ہو تو پھر ذات میں لے لیا جائے۔ اس تقریب کے لئے نکوٹالانے ایک دعوت کا سامان کیا۔ اس کی خبر راسمی کو پہونچی اور برق بن کر اس کے یکلمے کے پار ہو گئی۔ جب ذرا سنبھلی اور ہوش میں آئی تو آنسوؤں کے سوتے بہ نکلے اور آتش عشق نے اس کو اس درجہ مضطرب کیا کہ گھر سے چل نکلی اور اُس مقام پر پہونچی جہاں اُن برہمنوں کا اجتماع تھا۔ مجمع میں چاندی داس کو دیکھ کر وہ اپنے حواس میں نہ رہی اور زار و قطار رونے لگی۔ چاندی کی جب اس پر نظر پڑی تو اپنے سارے وعدے بھول گیا اور پردانہ وار اس کے قدموں پر جا گر اور معافی کی التجا کرنے لگا۔ اس واقعہ کے بعد وہ زندگی بھر برہمن دیوتاؤں کو چھوڑ کر اس حسن کی دیوی کو پوجتا رہا۔ اس نے اپنے کلام میں بارہا راسمی کو فیدوں کی مان گیا تری لکھ پچا رہا ہو ایک مقام پر چاندی داس بکتا ہو۔

”اودھوبن میری ملکہ تو میرے لئے وہ سب کچھ ہو جو ایک بچے کے لئے ماں باپ ہوتے ہیں۔ وہ نماز نالائہ جو ایک برہمن روزانہ اپنے خدا کے لئے پڑھتا ہے میں تیری پرستش میں ادا کرتا ہوں۔ تو میرے لئے اتنی ہی پاک ہی معنی گیا تری جس سے دیدوں نے جنم لیا ہو۔ میں تجھ کو سرا دتی دیوی جانتا ہوں جو مجھ میں نعمہ پھونکتی ہے۔ میں تجھ کو پر جی جانتا ہوں۔ تو میری گردن کی مالا ہو۔ تو میرا آسمان ہو اور میری زمین اور میری آنکھوں کا اُجالا ہو جس دن میں تیرے چاند سے ٹکھڑے کو نہیں دیکھتا ہوں اُس روز شمر دے کہ رہتا ہوں تیری دشویرگی پر میرا عشق کوئی نفسانی خواہش نہیں رکھتا ہو۔“

چاندی داس کی بلند خیالی و نعمہ نوازی اور جذبہ فطرت کی حقیقی مصوری کا سبب فیل نظم سے پتہ چلتا ہو۔

”ایسا افانہ کسی نے کبھی نہ سنا ہوگا۔ اُن کے دل روز ازل سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں (در ازل بود کہ پیاں محبت بستند) وہ ایک دوسرے کے سامنے ہیں مگر فرقت کے اندیشہ

سے رو رہے ہیں اگر ایک دوسرے کی نظر سے ایک لمحہ کے لئے بھی ہٹ جاتے ہیں تو اُن پر موت سے زیادہ سخت گھڑیاں گزر جاتی ہیں اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ آفتاب کنول کو پیار کرتا ہی لیکن کنول کمر میں مڑ جاتا ہے اور آفتاب خوش و خرم رہتا ہی۔ تم کہتے ہو کہ بادل اور چٹا کا ایک دوسرے کو محبوب ہیں لیکن ابراہیم وقت معینہ کے قبل ایک قطرہ پانی بھی اس چٹریا کو نہیں دیتا۔ پھول اور شہد کی مکھی طالبِ مطلوب کہے جاتے ہیں لیکن شہد کی مکھی اگر پھول کے پاس نہیں آتی پھول اُس کے پاس بھی نہیں جاتا۔ چکوڑ کو چاند کا عاشق کہنا حاکت ہی۔ چاندی داس کے عشق کا کسی سے مقابلہ کرنا ہی عبت ہی۔“

ایک مقام پر مفارقت کا منظر کھینچتے ہوئے چاندی داس کہتا ہی:-

”وہ اپنے داس سے اپنے محبوب کو پنکھا جھلتا ہی اور اگر وہ اپنا سر ذرا بھی پھیر لیتا ہے تو یہ جدائی کے خوف سے لرز اُٹھتا ہی۔ جب ملاقات ختم ہونے پر آتی ہے تو میری روح میرے جسم سے پرداز کر جاتی ہی۔ آہ اس کو بیان کرتے ہوئے میرا کلیجہ پھٹتا ہی!!!“

کیا میں اب جاؤں؟ وہ تین بار یہ سوال کرتا ہی۔ آہ ان لفظوں کے ساتھ کتنی ہم آغوشیاں اور کتنے گرم بوسے ہوتے ہیں وہ ادھا قدم چلتا ہے اور پھر ملٹ کر میری طرف تاکتا ہی۔ وہ میرے چہرے پر ایسی مضطربانہ نظر ڈالتا ہی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیتا ہی اور مجھے اپنی قسم کھانے کے لئے کہتا ہی۔ آہ وہ دوسری ملاقات کے لئے کس طرح میری خوشامد کرتا ہی اس کا عشق اس قدر گہرا ہی اور اس کی التجائیں اس قدر صادق ہیں کہ انھیں ہمیشہ میرے دل میں رہنے دو۔“

چاندی داس ایک دوسری جگہ اپنے عشق کا ان الفاظ میں اعادہ کرتا ہی۔

”لے میرے محبوب تو میری زندگی ہی۔ میرا جسم اور میری روح سب تیری خدمت کے لئے ہیں میرا خاندانی اعزاز میری شہرت میرا ایمان، میرا شرف اور وہ سب کچھ جو میرا ہے تیرا ہی۔“

سچ تو یوں ہی کہ چاندی و کس اور دیا پتی جو اس کا ہم عصر تھا اور پندرہویں صدی کے آخر تک زندہ رہا، ان دو زبردست شاعروں کے ہوتے مردہ سے مردہ زبان بھی اُٹھتی۔ بنگالی شاعری پڑانیں کے زمانہ سے حقیقی معنوں میں "شاعری" کا اطلاق ہوتا ہی۔ فارسی زبان کا بھی تسلط پورے طور پر اب اس زبان پر ہو گیا تھا اور حافظ، سعدی، مولانا روم اور فرید الدین عطار لوگوں کے زبان زد تھے کہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں صوفیائے کرام کے مسلک نے تمام ہندوستان میں ایک نئی رُوح چھونک دی اور ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ اس دور میں چار زبردست مصلح قوم پیدا ہوئے جنہوں نے ہندوستان کے چار گوشے سنبھالے جتنیا بنگال میں، دنیاں دیو ہمارا شتر میں، کبیر وسط ہند میں اور نانک پنجاہ میں۔ ان چاروں کا ایک ہی مسلک تھا صرف جزویات میں معمولی طور پر ایک دوسرے سے اختلاف تھا۔ جتنیا کہتا ہی کہ ہر شخص سری کرشن کی پرستش ذات پات سے علیحدہ ہو کر کر سکتا ہی اور ہر شخص اپنے خدا کی محبت میں فنا ہو کر اس کا ہم ذات ہو سکتا ہی۔ ایک مقام پر یہ کہتا ہی: "اگر ایک چندال متقی ہے اور خدا سے محبت رکھتا ہی تو وہ سب برہمنوں سے افضل ہی۔ اگر کوئی کہے کہ اے کرشن تو میری زندگی ہی تو وہ یعنی کرشن فوراً اسے سینے سے لگا لیگا۔ خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا ہو" جتنیا کی نظروں میں چھوٹ چھات کوئی چیز نہیں ہی اس کا قول ہے کہ اگر کوئی ایک ڈوم کے برتن میں کھلے تو وہ اپنی اس خاکساری کے صلہ میں رحمت الہی کا مستحق ہو گا۔ اگر ایک موچی سچے دل سے خدا کی یاد کرتا ہے تو میں اس کے سوا بار قدم چومنے کے لئے طیار ہوں۔ بٹا چاریوں نے اس کی مذمت و تذلیل میں کوئی دقیقہ اٹھانے رکھا اور آخر کار لاچار ہو کر قاضی سے فریاد کی کہ اس کا جلوس سنگرتنا جس میں یہ لوگ ہری کا بھجن گاتے ہوئے چلتے تھے شہر میں نکلنے سے بند کر دیا جائے۔ قاضی نے فتنہ و فساد کے خوف سے ایسا ہی کیا لیکن جتنیا نے اُسی روز شام کو نہایت شان و شوکت کے ساتھ جلوس نکالا اور بھٹیک قاضی کے دروازہ پر لے گیا۔ قاضی پہلے تو اپنے حکم کی نافرمانی پر بہت برا فروختہ ہوا مگر جب اُس نے جتنیا کی شراب محبت سے معمور آنکھیں جو شل آفتاب کے روشن تھیں دیکھیں تو اس کی سچائی کا قایل ہو گیا، اپنا حکم واپس لے لیا اور بڑے شوق سے جلوس دیکھتا رہا۔ جتنیا کو فنا فی الکرشن کہتے تو بجا ہے۔ یہ شخص اب بھی بنگال اور اوڈیس میں اوتار مان کر پوجا جاتا ہی یہ سلسلہ اے میں پیدا ہوا اور سلسلہ میں مر گیا۔ سولہویں صدی میں یہ زبان اپنے پورے شباب پر تھی اور جیسا کہ ہم اوپر بیان

کرائے ہیں، مدھورارس کی حُسن پرستی اور چٹینا کے دُورِ تصوُّف نے اس کو بہت بلند کر دیا تھا اور اب یہ تمام انسانی جذبات کی اتم درجہ پر ترجمانی کرنے پر قادر تھی۔ لیکن سترھویں صدی میں آکر شاہجہاں کے آخری دور کے ساتھ جب سُلطانوں کے زوال کی بنیاد پڑی اس کو بھی انحطاط ہوا۔ یہاں کی شاعری میں وہ فطری جذبات وہ بلند خیالات اور پاکیزہ تخیلات اب باقی نہ رہی تھے۔ شعرا نے خدائی چوکھٹ چھوڑ کر اب راجاؤں کے در کی جھبہ سائی شروع کر دی تھی اور ان کی خوشنودی کے لئے ان کی طبعی پرواز معشوقوں کی زلفوں میں پھنس کر رہ گئی تھی اور موئے کمر میں بندھ کر خود بھی معدوم ہو گئی تھی جس کی ایک مثال حسبِ ذیل ہے:

”لے راجہ میں اس کی زلف کی کس طرح تعریف کروں لوگ اس کو نافہِ خن سے تشبیہ

دیتے ہیں لیکن دماہنتی کی زلف کو اس چیز سے مشابہ کرنا جس کو جانور شرم سے اپنے شکم میں چھپائے رہتا ہی محض حماقت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی آنکھ مثلِ غزال (نظم میں خود غزال کا لفظ موجود ہے) کے ہی لیکن غزال اس رشک میں اپنے پیر زین پر پکٹتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے چاند کے جوہر سے دماہنتی کا چہرہ بنایا ہی اسی لئے چاند میں سورج ہو گیا ہی جسے لوگ غار کہتے ہیں۔ کنول دماہنتی کے حُسن سے شرا کر آبی قلعوں میں رُو پوش ہوئے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے دماہنتی کی تخلیق سے پہلے اور عورتوں کو پیدا کر کے انسانی حن کے صنایع میں مہارت حاصل کی تاکہ وہ دماہنتی کے جسم کو مکمل بنا سکے۔“

ایک تو مذاق اس قدر گر گیا تھا دوسرے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور بغاوت اور سازش کے ہر جگہ مدرسے کھل گئے تھے۔ قاعدہ ہیکہ دُور انقلاب میں قلم کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس کا میدان بالکل مسدود۔ اس صورت میں ضرورت تھی کہ کوئی اس زبان کا ناخدا پیدا ہو جو اس کو اس طوفان سے بچائے اور مستقبل کے مہیب دور کے لئے اس کی مستحکم بنیاد قائم کر جائے۔ جن جن زبانوں کی حیات خدا کو منظور ہوئی ہے ان کے لئے ایسے پرخطر دور میں ہمیشہ ایک مردِ غیب کا ظہور ہوا ہے جس نے کار نمایاں کئے ہیں چنانچہ بنگالی زبان کو بھی سنبھالنے اور عروج دینے کے لئے ایک شخص اس دور میں پیدا ہوا ہے کوئی برہمن یا گوتھی (بدھ مذہب رکھنے والا) نہ تھا بلکہ ایک مسلمان تھا جس نے زبان کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا لیا اور موخرین کا کیا ذکر ہے

اپنے متقدمین پر بھی سبقت حاصل کی۔ اگر اس کو بنگالی زبان کا پیغمبر سخن کہا جائے تو بجا ہی اور اگر مسلمان اس کی نسبت سے اپنے کو بنگالی زبان کا جالِ بخش کہیں تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

علاؤلِ نواب جلال پور کے ایک وزیر کا لڑکا تھا جب یہ کمسن تھا اس نے اپنے باپ کے ساتھ ایک ایک بحری سفر کیا۔ اس کے بیٹے پر پرتگالی بحری قزاقوں کا حملہ ہوا اور اس کا باپ ان سے دست بردست جنگ میں مارا گیا علاؤل کی قسمت میں ابھی اور بھی مصائب جھیلنے تھے جو ہر ادیب کا خاص حصہ ہوا کرتا ہے۔ وہ کسی طرح پیکار کا ناپونچا۔ یہاں کے صاحبِ حکومت مسلم وزیر ملگن ٹھاکر کی فرمائش سے اس نے پداوت کا ترجمہ بنگالی میں کیا۔ مگن ٹھاکر ہی کے کہنے سے اس نے سیف الملوک اور بدیع الجمال کا بنگالی میں ترجمہ شروع کیا لیکن اپنے مرنے کی اچانک موت سے برداشتہ خاطر ہو کر اس نے اس ترجمہ کو ادھورا چھوڑ کر گوشہٴ خانیت کی زندگی اختیار کی۔ مگر ابھی دنیا کے مصائب اس پر ختم نہ ہوئے تھے اور ابھی اس کو چند اور مصیبتوں کا سامنا کرنا تھا اسی زمانہ میں شجاع دور رنگ زیب کا بھائی ارکان بھاگ کر آیا اور اس آفت کے مارے سے اور سردار ارکان سے سخت جنگ ہوئی جس کا انجام شجاع کی فاش شکست تھا۔ ایک درانداز مرزا نامی نے جو علاؤل سے ملٹی بغض رکھتا تھا سردار ارکان سے یہ لگا دی کہ شجاع کی آمد میں علاؤل کی سازش شریک تھی۔ علاؤل قید خانہ میں ڈال دیا گیا اور کئی سال بعد وہاں کے مظالم سے اس کو نجات ملی۔ سید موسیٰ نے جو ارکان کا ذی اقتدار شخص تھا علاؤل کی ان برسوں میں خبر لی اور اسی کی فرمائش سے علاؤل نے سیف الملوک اور بدیع الجمال کا باقی ماندہ ترجمہ پورا کیا۔ دربار کے ایک ذی اثر شخص سید محمد خاں کے اصرار سے اس نے فارسی نظم ہفت پیکر کا بنگالی میں ترجمہ کیا اس کے علاوہ اس کی بہت سی نظمیں رادھا اور کرشن کی تعریف میں ہیں۔ علاؤل ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوا ۱۸۷۱ء میں قید کیا گیا اور اپنے رہائی کے بعد تیسری صدی کے آخر تک زندہ رہا۔

علاؤل نے بنگالی زبان میں کثرت سے سنسکرت کے الفاظ شامل کر کے اس کو بہت بلند کر دیا اور بنگالی زبان کے نئے محاورات کا بانی ہوا اس کی بلند خیالی اور نکتہ سنجی کا حسبِ میل نظم سے پتہ چلتا ہے۔

”پداوتی کے چہرے سے جو شعلہ نکلتی ہے وہ اس کرن کو جو ایک طلائی آئینہ سے نکلتی ہے ہر مارتی
ہو اس کے چہرے کے متعلق ایک امر نہایت تعجب خیز ہے وہ یہ کہ دو کنول ماہتابِ گہا میں

مقید ہیں۔ آفتاب جو اپنے دوستوں کو دشمن کے ہاتھوں اس طرح مجبوس دیکھتا ہی تو ان کی
 رہائی کے لئے پیشانی کے شہابی رنگ میں اُبھ آتا ہی۔ عشق کا دیوتا آفتاب کی مدد میں
 بھوؤں کی کمان کھینچتا ہے اور اس کی آنکھوں کا نشانہ ٹانگتا ہے لیکن انفوس یہ ہی
 کہ یہ دوست اتنے قریب رہ کر ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکے۔“

یہ استعارہ ملیح طلب ہی کنول اس کی آنکھیں ہیں۔ آفتاب سنکرت روایت کے مطابق کنول کا عاشق
 ہوتا ہی اور باہتاب اس کا دشمن کنول دن میں کھٹتا ہی اور شام کو مڑ جاتا ہی۔ بدیع الجہاں کے شہر میں
 علاء کتا ہی۔

”روشنی کی عزت کہاں رہ جاتی اگر یہ تاریکی کے پہلو پہ پہلو نہ رکھی جاتی۔ اگر دنیا میں ہر کار
 نہ ہوتے تو تقدس کی زندگی کی کون قیمت جانتا۔ سمندر کے نملین پانی مسمی ہم کو شیریں پانی کا
 زیادہ مزہ ملتا ہی۔ اگر گنوس نہ ہوتے تو ہم فیاض لوگوں کی تعریف نہ کر سکتے۔ سچ اور جھوٹ
 محض ایک تصویر کے دو رخ ہیں۔ اے علاء دل تو دنیا کی تعریف اور مذمت کو مت سُن۔
 جو تھوڑا ذخیرہ تو اپنے دل میں رکھتا ہی اسے بغیر کسی شہم و حجاب کے تو آزادی سے
 دنیا والوں کو تقسیم کر دے۔“

علاؤں نے ہندو رسم و رواج اور مذہبی ارکان کی ادائیگی کا اتنا اچھا موقع کھینچا ہے کہ تعجب ہوتا ہی
 کہ ایک مسلمان کیوں کر اس کام کو انجام دے سکا جس کو مذہبی شعرا تکمیل دینے سے قاصر رہی۔
 اس نے عاشق و معشوق کی بھڑائی کے دس مختلف پہلو اور صورتیں دکھلائی ہیں۔
 اس نے ادویات پر اتنی زبردست بحث کی جو اور فنِ حکمت پر اتنی مبصرانہ کتاب لکھی ہے کہ اس کو
 پڑھ کر ایک شخص پورا حکیم بن سکتا ہی۔

اس نے تیار دل کی گردش اور انسانی قسمت پر ان کے اثر کو اتنے مدق اور مکمل پر لے لیا ہے کہ اس کو
 کہ ایک نجومی اس سے سبق حاصل کر سکتا ہی۔

اس نے شاعری کے نئے اصول ایجاد کئے اور نئے اذعان مقرر کئے ہیں۔

غرض علاؤ الل نے اس زبان کو اتنی ترقی دی اور اس قدر مستحکم کر دیا کہ یہ سخت سے سخت حوادث کا مقابلہ کر کے اب ہندوستان کی ایک مستند زبان ہو گئی۔

اس زبان نے پراکرت سے جنم لیا۔ فارسی تربیت پائی اور سنسکرت کا جامہ پہنا۔ اس وجہ سے اس میں پراکرت کی پاکیزگی فارسی کی نازک خیالی اور شیرینی اور سنسکرت کی جامعیت سب موجود ہیں چوں کہ اس میں تین زبانوں نے اکٹھا ہو کر ایک نیا جنم لیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج یہ ہر جذبہ کی ترجمانی پر اس قدر قادر ہے اور تخیل کی ہر پرواز اس میں اپنا نشیمن پاتی ہے لیکن سب سے زیادہ حصہ اس میں فارسی کا ہے اور اس کے ثبوت کی زیادہ ضرورت نہیں اس لئے کہ مسلمانوں کے زمانے کی کل تصانیف مسلم بنگا کہ کہلاتی ہیں۔

تاریخ۔

سلطنت مسلمانان ہندوستان

نوشتہ

حکیم شیدمس اللہ قادری - ایم - آر - اے - ایس
کارپانڈنگ نمبر آف دی نیماٹک سوسائٹی آف انڈیا نمبر
آف دی ہٹارکل سوسائٹی آف پنجاب وغیرہ وغیرہ

باب اول

مقدمہ

فتوحات اسلام - وسط ایشیا میں خود مختار مملکتوں کی ابتدا - آل طاہر - آل صفار - آل سامان - آل زیار
 ابگین - آل بگین - سلاوین - آل سلگین - آل سلگین کے عہد میں وسط ایشیا کی علمی حالت - آل سلگین کا
 ذوق علمی - مملکت آل سلگین کے علمی مرکز - فارسی شاعری

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱؎ھ) تک اسلامی حکومت عربستان کے کل خیرہ نما

میں پھیل گئی تھی۔ حضرت ابو بکر صدیق (ؓ تا ۶۳۴ء) کے عہد خلافت میں پیروان اسلام نے عجب باہر قدم رکھا۔ چالیس سال کے اندر اندر ایران و خراسان کو فتح کر کے دریائے نیلاب تک پہنچ گئے۔ مغرب میں مسلمانوں نے پہلے پہل مصر میں قدم رکھا۔ پھر بحر اربعہ کے کنارے کنارے برابر و کار تہج کو فتح کرتے ہوئے ۹۱ء تک ہسپانیہ میں پہنچ گئے۔ قرن اولیٰ کے ختم ہونے سے پہلے بحر اوقیانوس سے دیوار چین تک دنیا کا دو تہ ثلث رقبہ مسلمانوں کے حیطہ اقتدار میں آگیا۔

خلفائے عباسیہ (۱۳۶ء تا ۶۵۶ء) کے اوائل عہد میں اس عظیم الشان سلطنت کو انحطاط شروع ہوا دور و دراز کے علاقے خلفائے اشراق و اقتدار سے آزاد ہونے لگے۔ مغرب سے اس کی ابتدا ہوئی۔ عبدالرحمن اموی (۱۳۹ء تا ۱۷۲ء) نے ۱۳۹ء میں ہسپانیہ میں علم استقلال بلند کیا۔ اس کے بعد مصر اور شمالی افریقہ میں بنی اغلب (۱۸۶ء تا ۲۹۶ء) اور بنی طولون (۲۵۲ء تا ۹۶۹ء) کے خود مختار خاندان قائم ہوئے۔ خلیفہ مامون (۱۹۸ء تا ۲۳۳ء) کے زمانہ سے مشرق میں خود مختار حکومتوں کا آغاز ہوا۔ مامون نے اپنے صاحب ابھیش طاہر ذوالیمین کو خراسان کا والی مقرر کیا تو اس نے اپنی قوت و اقتدار کو بڑھا کر طوق اطاعت سے آزاد ہونے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلفائے بغداد نے خراسان کی حکومت کو اس کے خاندان میں موروثی تسلیم کر لیا۔ اسی زمانہ میں خلفا کی کمزوری سے دیگر دایان ملک نے بھی فائدہ اٹھایا۔ بحر اخصر کے نیچے و عظیم دگیلان میں سادات علوی آزاد ہو گئے۔ سبستان و نیمروز میں یعقوب بن لیث بن صفار کا ظہور ہوا۔ اور ٹھوڑی ہی مدت میں اس نے آل طاہر کو خراسان سے بیدخل کر کے ہرات سے شیراز تک تمام ایران پر قبضہ کر لیا اور ایسی قوت پیدا کی کہ خلفائے بغداد بھی اس سے ہراساں ہونے لگے۔

تیسری صدی کے اخیر ایام میں آل سامان نے میدان ترقی میں قدم رکھا۔ اس خاندان کے مورث علی اسد بن سامان کے چار لڑکے مامون کے زمانہ میں ماوراء النہر کے مختلف علاقوں پر گورنر مقرر ہو گئے تھے۔ ان میں فوح بن اسد جو سمرقند کا والی تھا بہت ہوشیار اور اولوالعزم آدمی تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے علاقہ کا انتظام کیا بلکہ دوسرے بھائی احمد بن اسد سے فرمانہ کوئے ترکستان میں کا شغرتک اپنی حکومت کو وسیع کر دیا۔ فوح کے ان ابتدائی فتوحات سے ماوراء النہر میں ایک چھوٹی سی حکومت قائم ہو گئی جسے اس کے جانشین

اسمٰعیل بن احمد (۲۶۹ھ تا ۲۹۹ھ) نے اپنے زمانہ میں خوب ترقی دی۔ خلیفہ بغداد کی تحریک سے اس نے ۲۸۷ھ میں صفاریوں (۲۹۹ھ تا ۳۰۹ھ) پر لشکر کشی کی۔ عمر بن لیث کے گرفتار ہو جانے سے خراسان پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے طبرستان کے حاکم محمد بن زید علوی کو شکست دے کر اپنا مطیع بنالیا۔ اسمٰعیل کے یہ فتوحات بڑھتے ہوئے دجلہ تک پھونچ گئے اور ایران و خراسان کا تمام ملک اس کے تصرف میں آ گیا۔ لیکن اس وسیع مملکت پر سامانیوں کا قبضہ تھوڑے ہی زمانہ تک قائم رہا۔ آل بویہ (۳۲۲ھ تا ۳۵۵ھ) کے ظہور سے عراق اور جنوبی ایران میں ان کی حکومت ختم ہو گئی۔ قریب قریب اسی زمانہ میں الینگین نے جیوں کے نیچے سلطنت غزنویہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ ترکستان میں ترکان افراسیابہ نے عروج پکڑنا شروع کیا۔ ان جدید حکومتوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے سامانیوں کی طاقت مسدود کر دی۔ اخیر کے دونوں خاندان اگرچہ سامانیوں کے مطیع اور زیر فرمان تھے، لیکن ان کے ضعف و انحطاط سے برابر فائدہ حاصل کرتے رہے۔

میان تک کہ ایک خاں (۳۸۳ھ تا ۳۹۹ھ) نے ۳۸۹ھ میں بخارا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد سلطنت سامانیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

آل سامان کے دربار میں کثرت سے ترکی غلام تھے اور ان بادشاہوں نے انہیں سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا تھا۔ ان غلاموں میں ایک کا نام الینگین تھا۔ عبدالملک بن نوح (۳۲۳ھ تا ۳۹۱ھ) نے اسے ۳۷۲ھ میں ہرات کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن کسی وجہ سے ۳۹۱ھ میں معزول کر کے یہ خدمت ابو الحسن بن علی سیمور کو تفویض کر دی۔ الینگین اپنی معزولی سے ناراض ہو کر افغانستان میں چلا آیا اور غزنین کو صدر مقام قرار دے کر چھوٹی سی حکومت قائم کر لی۔ ۳۹۲ھ یا ۳۹۳ھ میں الینگین کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا ابواسحق اور اس کے بعد دو ترکی غلام ملک تینگین اور پیری یکے بعد دیگرے چودہ سال تک غزنین میں حکومت کرتے رہے۔ ۴۰۶ھ شعبان ۳۶۶ھ کو نوح بن منصور (۳۶۶ھ تا ۳۸۷ھ) کے ایما سے پیری نے حکومت غزنین سبکتگین کے حوالے کر دی۔ اس تاریخ سے سلطنت آل سبکتگین کی بنیاد پڑی ہے۔

امیر ناصر الدین سبکتگین جب برسرِ حکومت ہوا تو اس کے قبضہ میں بہت تھوڑا ملک آیا۔ لیکن

اس نے اپنی قوت کو بڑھا کر مقبوضات میں وسعت دینا شروع کیا۔ پنجاب کے ہندوؤں کو شکست دے کر پشاور پر قبضہ کر لیا۔ شمال میں بڑھتا ہوا خراسان تک چلا گیا۔ ۳۸۳ھ میں ابو علی سیجور نے ماوراء النہر میں بغاوت کی اور امیر نوح بن منصور سے اس کی مدافعت نہ ہو سکی تو نوح بن منصور نے بگلگین سے مدد چاہی۔ بگلگین کی حسیلیات سے جب بغاوت فرو ہو گئی تو نوح بن منصور نے خوش ہو کر افغانستان کی حکومت کے ساتھ خراسان کی حکومت بھی اس کو تفویض کر دی اور اس کے (لٹکے) امیر محمود کو سیف الدولہ کا خطاب دے کر یہاں کا سپہ سالار مقرر کیا۔ بگلگین اس مہم سے واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں بمقام ترمذ ۳۸۶ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بگلگین کے بعد اس کا لڑکا اسمعیل برسر حکومت ہوا لیکن محمود نے اُسے معزول کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس وقت سلطنت سامانیہ تباہی کے قریب ہو گئی تھی۔ نوح بن منصور (۳۸۶ھ) کے مرنے سے ماتحت حکام کو خوب اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ جنوب میں محمود کی اور شمال میں ایک خاں کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ عبدالملک بن نوح (۳۹۹ھ) ایک خاں کے مقابلہ میں کئی بار ہزیمت اٹھا کر ارزو القعدہ ۳۹۹ھ کو گرفتار ہو گیا تو اس پر وسط ایشیا کی اس عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ مملکت سامانیہ کو محمود اور ایک خاں نے باہم تقسیم کر لیا۔ دریا سے جیچوں و دونوں کا حد فاصل قرار پایا۔ شمال ملک جس سے ماوراء النہر مراد ہے ایک خاں نے لے لیا اور جنوبی علاقہ جس میں خراسان و افغانستان شامل ہیں سلطان محمود کی سلطنت میں داخل ہو گیا۔

سلطان محمود نے ۳۹۲ھ سے ۴۱۲ھ تک قریباً بائیس سال کے عرصہ میں ہندوستان پر بارہ حملے کئے جن کے حالات مورخ محمد قاسم فرشتہ نے تفصیل وار تحریر کئے ہیں۔ ان حملوں کی وجہ سے اس کی حکومت جنوب میں بتدریج وسیع ہوتی گئی کیشور و پنجاب کی فتح کے بعد ۴۱۲ھ میں تھوچ و مہتر اس کے قبضہ میں آئے۔ ۴۱۲ھ میں کابل و بلخ کے راجہ کو مطیع بنایا۔ ۴۱۲ھ میں گجرات پر لشکر کشی کر کے سومات کو تاخت و تاراج کیا۔ ہندوستان کے علاوہ محمود نے شمال میں جو فتوحات حاصل کئے ہیں ان کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اس نے ایک خاں کو شکست دی بعد ازاں غور کو ۴۱۴ھ میں خوارزم کو ۴۱۶ھ میں مغاب

کو فتح کیا۔ اسی سال ماوراء النہر کا ایک وسیع علاقہ جس میں سمرقند و بخارا واقع ہیں سلطنت غزنویہ میں شامل ہو گیا۔ ۱۱۲۶ء میں آل سلجوق نے اطاعت قبول کی۔ ۱۱۲۶ء میں آل بویہ نے ہرمیت اٹھا کر اصفہان کا تختہ گریا۔ محمود نے ۳۱ سال حکومت کی اس مدت میں اس کی سلطنت سیحون سے خلیج فارس اور بحر احمر سے دریائے خنجر تک پھیل گئی تھی۔ لیکن اس کو جس قدر جلد ترقی ہوئی تھی اسی قدر جلد تنزل و انحطاط ہو گیا۔ محمود کے بعد سلجوقیوں نے خوب زور کھڑا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایران و ماوراء النہر کے کئی صوبے بلج، خوارزم، اصفہان، رے وغیرہ مسعود سے چھین لئے۔ علاء الدین غوری نے بہرام شاہ کے زمانہ میں جب غزنیں کو فتح کر لیا تو سلاطین غزنویہ نے لاہور میں اپنا دار السلطنت منتقل کر دیا اور ان کی حکومت صرف شمالی ہندوستان میں باقی رہ گئی۔ لیکن شاہان غور کی دست برد سے پنجاب بھی باقی نہیں رہا۔ ۱۱۵۶ء میں یہ لوگ دریائے چناب تک چلے آئے اس کے بعد ۱۱۸۶ء میں لاہور پر یورش کر کے خرو ملک کو گرفتار کر لیا اور اس پر سلطنت آل سبکتگین کا خاتمہ ہو گیا۔

سلاطین آل سبکتگین

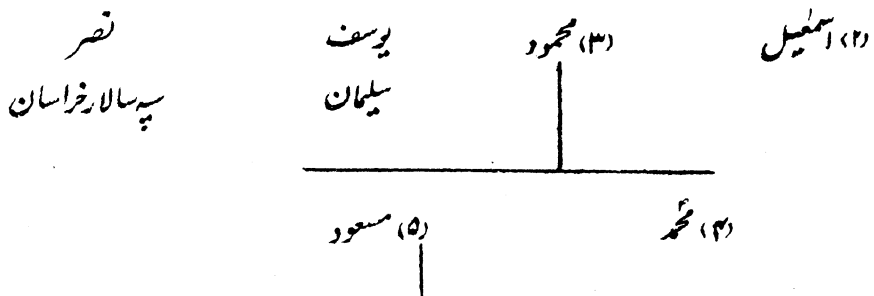
۳۶۶ھ ۹۶۶ء ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء

۳۶۶ھ	۹۶۶ء	۱	امیر ناصر الدین سبکتگین
۳۸۷ھ	۹۹۷ء	۲	امیر اسماعیل بن سبکتگین
۳۸۸ھ	۹۹۸ء	۳	بین الدولہ محمود بن سبکتگین
۴۲۱ھ	۱۰۳۰ء	۴	عادل الدولہ محمد بن محمود
۴۲۱ھ	۱۰۳۰ء	۵	نصیر الدولہ مسعود بن محمود
۴۳۲ھ	۱۰۴۰ء		محمد بن محمود (مکرر)
۴۳۲ھ	۱۰۴۰ء	۶	شہاب الدولہ مودود بن مسعود
۴۴۰ھ	۱۰۴۸ء	۷	مسعود بن مودود (شیرخوار)

- ۸ بهارالدوله علی بن مسعود ۴۴۰ هـ ۱۰۴۸ ع
- ۹ غزالدوله عبدالرشید بن مسعود ۴۴۰ هـ ۱۰۴۸ ع
- طغرل غاصب ۴۴۲ هـ ۱۰۵۲ ع
- ۱۰ جمال الدوله فرخ زاد بن مسعود ۴۴۲ هـ ۱۰۵۲ ع
- ۱۱ رضی الدوله ابراهیم بن مسعود ۴۵۱ هـ ۱۰۵۹ ع
- ۱۲ علاء الدوله مسعود ثانی بن ابراهیم ۴۹۲ هـ ۱۰۹۰ ع
- ۱۳ عضد الدوله شیرزاد بن مسعود ۵۰۸ هـ ۱۱۱۴ ع
- ۱۴ سلطان الدوله ارسلان بن مسعود ۵۰۹ هـ ۱۱۱۵ ع
- ۱۵ مغرالدوله بهرام بن مسعود ۵۱۲ هـ ۱۱۱۸ ع
- ۱۶ سراج الدوله خسرو بن بهرام ۵۲۴ هـ ۱۱۵۲ ع
- ۱۷ تلج الدوله خسرو ملک بن خسرو ۵۵۵ هـ ۱۱۸۶ ع

شجره نسب

(۱) سبکگلن



(۶) مودود علی (۸) عبدالرشید (۹) فتح زاد (۱۰) ابراہیم (۱۱) مجدد
(۷) مسعود ثانی

سیف الدولہ محمود
گورنر ہندوستان

(۱۲) مسعود ثالث

(۱۳) شیر زاد (۱۴) ارسلان (۱۵) بہرام
(۱۶) خسرو
(۱۷) خسرو ملک

جس زمانہ میں آل سبکتگین کا ظہور ہوا ہی، وسط ایشیا میں آفتاب علم و فن اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ قریب قریب اسی زمانہ میں امام بخاری، امام مسلم، ابونصر فارابی، بوعلی سینا، امام رازی، ابو الفضل جوہری وغیرہ اسی سرزمین کی مردم خیز بستیوں میں پیدا ہوئے تھے۔ وسط ایشیا میں اس وقت جو حکومتیں قائم تھیں ان سب کے حکمران عموماً صاحب علم و فن اور علوم و فنون کے مربی و سرپرست تھے۔ ان حکومتوں میں ماوراءالنہر کے سامانی حکمران سب سے زیادہ طاقت ور اور ذی اثر تھے۔ علمی سرپرستی کے لحاظ سے بھی ان کا پایہ بڑھا ہوا تھا۔ اس خاندان کا تیسرا فرزند ابونصر بن احمد (۳۱۳ھ - ۳۲۲ھ) بڑا فیاض اور نہر پرور بادشاہ ہوا ہی۔ استاد ابوالحسن رودکی جس کو فارسی شاعری کا ابوالآبہ کہتے ہیں اس کے دربار میں ملک الشعراء کے عہدے پر مامور تھا۔ بادشاہ کی فرائض سے اس نے کلیلہ دمنہ کے حکایات فارسی میں نظم کئے تھے۔ اور اس کے صلہ میں چالیس ہزار دہم کا عطیہ ملا تھا۔ غنصری اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا ہے:

جہل ہزار درم روڈ کی زہتر پیش عطا گرفت بنظم کلید درکشور
 فوج بن نصر ۳۳۱ھ ۳۳۲ھ نے دارالسلطنت بخارا میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا
 جس میں نادر و نایاب کتابیں جمع تھیں بوعلی سینا نے اس کتاب خانہ کو دیکھا تھا اس کا بیان ہے کہ :
 ”اس میں قدما کی اکثر تصنیفات ایسی موجود ہیں کہ جن کے نام بھی کسی کو معلوم
 نہیں تھے اور خود میں نے بھی انہیں آج تک نہیں دیکھا تھا“

فوج بن نصر کو علوم فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی۔ خلفائے بغداد کے زمانہ میں فلسفہ یونان کی جو کتابیں عربی
 میں ترجمہ ہوئی تھیں ان میں کثرت سے غلطیاں موجود تھیں۔ بادشاہ کی فرمائش سے ابو نصر فارابی نے ان
 تمام ترجموں کو صحیح و درست کیا اور ان کی مدد سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں فلسفہ یونان کے تمام مسائل
 جمع کئے اور اس کا نام تعلیم ثانی رکھا۔ اسی کتاب کی بدولت اس کا لقب معلم ثانی مشہور ہوا ہے
 فوج بن نصر کے دو جانشین منصور بن فوج ۳۵۱ھ ۳۶۶ھ اور فوج بن منصور ۳۶۶ھ ۳۸۶ھ

بھی علمی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ منصور بن فوج نے عربی سے فارسی میں کئی کتابیں ترجمہ کرائی
 ہیں۔ ایران کے جو مسلمان عربی سے ناابلہ تھے ان کے لئے قرآن مجید کے سمجھنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا۔
 اس ضرورت کو محسوس کر کے منصور نے سمرقند، سیجباب، فرغانہ سے علمائے وقت کو طلب کیا اور ان سے
 امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کی تفسیر کبیر کا ترجمہ کرایا۔ اسی زمانہ میں اس کے وزیر ابوعلی محمد بن محمد عجمی
 امام طبری کی دوسری تصنیف تاریخ کبیر کا ترجمہ کیا۔ اسی منصور بن فوج کے زمانہ میں امیر ابو منصور بن
 عبدالرزاق طوس کا گورنر تھا۔ اس کو تاریخ عجم سے خاص دلچسپی تھی۔ ہرات، سیستان، شاپور، اور طوس

۱۔ ابن خلکان۔ ترجمہ بوعلی سینا ۱۔ طائغی کی زادہ نے مفتاح السعاده (جلد ۱ صفحہ ۲۴۲) میں اور اس کی پیردی میں حاجی خلیفہ نے
 کشف الطنون (باب ۱۸) میں اس واقعہ کو منصور بن فوج کے عہد سے منسوب کیا ہے لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ اس لئے کہ فارابی نے ۳۳۹ھ میں
 انتقال کیا (مفتاح السعاده جلد ۱ صفحہ ۳۶۰) اور منصور اس کی وفات کے گیارہ سال بعد ۳۵۰ھ میں برسر حکومت ہوا ہے
 ترجمہ اردو صفحہ ۸۶) ۲۔ اس کا ایک نہایت نفیس قلمی نسخہ فرانس کے کتب خانہ ملی میں موجود ہے (دیکھو بیجا مرزا بنامہ صفحہ ۹) ۳۔ یہ ترجمہ
 نولی کشور پریس لکھنؤ میں ۱۲۹۱ھ میں طبع ہوا ہے اور اس کا فرانسیسی ترجمہ چار جلدوں میں ۱۸۶۶ھ میں بمقام پریس چھپا ہے

کے چار موبدان مجوس کو جمع کر کے اُن سے خدائی نامہ کا پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کرایا اور اُس کا نام شاہنامہ رکھا۔

مشہور شاعر منصور بن احمد دقیق فوج بن منصور کا درباری شاعر بھی تھا اور بادشاہ کی فرمائش سے اس نے تاریخ عجم کو نظم میں لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن اُس کی بے وقت وفات سے یہ کام ادھورا رہ گیا جس کو فردوسی نے اختتام کو پہنچایا۔

آل وشمگیر کو بھی علمی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ یہ خاندان طبرستان میں حکمران تھا شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیرؒ تاسیخ ۳۶۴ھ جو سلطان محمود کا معاصر ہی بلند پایہ عالم گزرا ہے۔ عربی فارسی میں شعر خوب کہا کرتا تھا۔ خطاطی میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ وزیر صاحب عباد نے جب اس کے نوشتہ کو دیکھا تو ان الفاظ میں اس کی تعریف کی ”ہذا خط القابوس امختاح الطائوس“۔ امام ابوہریر صعلو کی نے جو خراسان کے قاضی القضاات تھے اس کی مدح میں متعدد تصنیفات لکھی ہیں۔ ابوریحان البیرونی سلطان محمود کے دربار میں آنے سے پہلے عرصہ تک امیر قابوس کے دربار میں رہا ہے اور اسی زمانہ میں اس نے اپنی تاریخ اُم قدیمہ لکھی ہے جس کا نام آثار الباقیہ فی قرون الخالیہ ہے۔ فلک المعالی امیر منوچہر بن قابوسؒ تاسیخ ۴۱۶ھ کو شعر و سخن سے خاص شغف تھا اور منوچہری دامغانی نے اسی کے دربار میں تربیت حاصل کی تھی۔

آل مامون کے محاسن و آثار سے ادب و تاریخ کی کتابیں مالا مال ہیں۔ یہ خاندان خوارزم میں حکمران تھا اکثر موزنین نے اس کا نام خوارزم شاہیان قدیم لکھا ہے۔ علی بن مامون بن محمد خوارزم شاہ کے زمانہ میں بولی سینا خوارزم میں آیا تھا۔ اور بادشاہ نے اس کی نہایت قدر دانی کی تھی۔ ابو بحین السہیلی جو مشہور نقیب و ادیب ہے، اس کا اور اس کے بھائی ابو العباس مامون بن خوارزم شاہ کا وزیر تھا۔ ابو العباس اس خاندان میں سب سے زیادہ علم دوست اور بہر پرور بادشاہ ہوا ہے۔ ابو انخیر خارا۔ ابوریحان البیرونی۔ بوعلی سینا وغیرہ (جن کا شمار اسلام کے حکماء اولین میں ہوتا ہے، یہ سب اس کے دربار میں جمع تھے) اس کے نام پر بہت سی

کتابیں لکھی گئی ہیں۔ امام ابوالمصور ثعلبی نے بھی ایک کتاب الطوائف والنظائف کو اس کے نام سے نام زد کیا ہے۔
 سبستان و نیموزیں سلطان محمود کے وقت خلف بن احمد کی حکومت تھی اس کا سلسلہ سلاطین آل صفار
 سے ملتا ہے۔ خلف بن نوپنے زمانہ کا سب سے بڑا علم دوست بادشاہ ہوا ہے۔ اُس کی قدردانی سے اطراف
 واکنات کے اہل کمال دربار سبستان میں جمع ہو گئے تھے۔ شعلے عرب کی کثیر جماعت اس کے دربار میں موجود
 تھی۔ مشہور ادیب بیع الزماں ہمدانی اس کا ندیم خاص تھا۔ ابوالفتح ہستی نے اس کی مدح میں تین شعر موزوں
 کئے تو صلہ میں تین سو دینار سُرخ عطا کئے تھے۔ اس عہد کے بڑے بڑے علماء کو جمع کر کے اُس نے
 قرآن مجید کی ایک ایسی تفسیر لکھوائی تھی کہ اُس میں صرف و نحو حدیث فقہ کلام کے جمیع مسائل درج تھے۔ اُس کی
 تالیف میں تین ہزار دینار سُرخ کا صرفہ ہوا تھا۔ مورخ عقی نے نیشاپور کے کتب خانہ صابونی میں اس تفسیر کا
 ایک نسخہ پچھم خود دیکھا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ یہ کتاب اس قدر کبیرا کچھ ہے کہ ایک کاتب تمام عمر اگر اس
 کو لکھتا رہے تب بھی تمام کتاب کا نقل ہونا محال ہے۔ ابوالشرف ناصح نے یمنی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ یہ
 تفسیر ۳۷۵۰ تک نیشاپور میں تھی۔ اس کے بعد صفہان میں منتقل ہو گئی اور وہاں آل خجندہ کے کتب خانہ میں محفوظ
 تھی۔ اور بڑی قطع کی ایک سو جلدیں تھیں۔

اسلام کا نامور حکیم شیخ الرئیس بوعلی سینا (ولادت ۳۵۰ھ وفات ۴۲۵ھ) اسی زمانہ میں پیدا
 ہوا اور اسی ہمرزین میں عمر بسر کی۔ تحصیل علم سے فراغت پانے کے بعد بخارا میں آیا۔ اور ایک مدت تک
 نوح بن منصور کے دربار میں رہا۔ اسی زمانہ میں امیر ابوالحسن العروسی کی فرمائش سے کتاب المجموع تصنیف
 کی جس میں ریاضیات کے سوا فلسفہ کے جملہ علوم مذکور ہیں۔ اس کے بعد نوح بن منصور کے ایما سے پانچ
 جلدوں میں طبی اصطلاحات کو جمع کیا اور اس کا نام لغات سدیدہ رکھا۔ منصور کی وفات کے بعد بخارا سے نکل
 کر خوارزم میں آیا اور کچھ عرصہ تک وزیر ابوالحسن اہلبلی کے یہاں مقیم رہا۔ اس زمانہ میں علم منطق اور علم کیمیا میں
 دو کتابیں لکھیں اور ان کو وزیر ابوالحسن کے نام سے موسوم کیا۔ امیر قابوس کے زمانہ میں خوارزم سے طبرستان
 میں آیا۔ قابوس نے اس کی خوب قدر و منزلت کی۔ اُسی زمانہ میں اُس نے اپنی مشہور تصنیف کتاب الشفا رکو

اٹھارہ مہینہ میں تصنیف کیا۔ علاء الدولہ قابوس کا بھائی تھا۔ اس کی فرمائش سے فارسی میں ایک کتاب لکھی جو حکمتِ علانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں فلسفہ کے جملہ علوم درج ہیں۔ قابوس کی وفات کے بعد شیخ ہمدان میں چلا آیا اور آل بویہ کی سرپرستی میں زندگی کا بقیہ حصہ گزار دیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ بادشاہ ہزار دے، وزیر امیر سب صاحبِ فضل و کمال تھو اور درہاٹیشا کے ہر گوشہ میں علمی مذاق پھیلا ہوا تھا۔ حکومت آل سامان کے ختم ہو جانے سے سلطان محمود کی حکومت خراسان میں پھیل گئی۔ سبستان و نیمروز، سیستان میں جوزجان، سیستان میں خوارزم فتح ہوئے اور یہاں کی حکومتیں تباہ ہو گئیں۔ آل دشگیر آل سلجوق و آل بویہ نے اطاعت قبول کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان محمود کی سلطنت مشرق میں سب سے بڑی تسلیم کر لی گئی۔ اور ان برباد شدہ حکومتوں میں جو اباب کمال جمع تھے وہ سب آل سبکتگین کے سایہ عاطفت میں چلے آئے۔

موزن نے آل سبکتگین کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا علم و دوست اور مربی علم و فن تسلیم کیا ہے۔ اس خاندان کو نشرِ علوم کا خاص خیال تھا۔ اس کے عہد کے تمام مشاہیر فضل و کمال اس خاندان کے فیضِ کرم سے بہرہ ور ہو رہے تھے۔ اشاعتِ تعلیم کے لئے اس خاندان نے اپنے قلمرو میں سینکڑوں مدارس قائم کئے تھے۔ اور اس بارے میں ایک قابلِ اتیان خصوصیت یہ ہو کہ امیر نصربن سبکتگین نے دنیائے اسلام میں سب سے پہلے مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد مصر اور بغداد میں مدارس کی بنیاد پڑی ہو۔

آل سبکتگین کی سلطنت میں تین شہر صدر مقام تھے۔ غزنیں دار الحکومت تھا۔ نیشاپور میں خراسان کا سپہ سالار اور لاہور میں ہندوستان کے گورنر رہا کرتے تھے۔ یہ تینوں مقام اپنے زمانہ عروج میں علم و فن کے مرکز تھے۔ نیشاپور کی علمی حالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہو کہ دنیائے اسلام میں سب سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ قائم ہوا ہے۔ غزنویوں کے زمانہ میں نیشاپور میں کئی مدرسے جاری تھے۔ نصربن سبکتگین کا مدرسہ سعیدیہ، امام ابن خورک کا مدرسہ نصریہ، امام ابوالقاسم کا مدرسہ ہیتیہ وغیرہ۔ یہ مدرسے اس قدر وسیع پیمانہ پر قائم تھے کہ مورخین نے ان کو ”امہات المدارس“ کا لقب دیا ہو۔ طغرل بیگ سلجوقی نے جب نیشاپور فتح کیا تو اس نے بھی

یہاں ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ حکیم ناصر خسرو نے اپنے سفر نامہ میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے۔
 ”روز شنبہ یازدہم شوال سنہ سبع وثلثین واربعمائے وارد نیشاپور شد۔ چار شنبہ آخر اس
 ماہ کو فوت بود۔ و حاکم زمان طغرل بیک محمد بود برادر چغری بیک۔ بنائے مدرسہ فرمودہ بود بزرگ
 بازار سراجان۔ و اس راجا رت ہی کردند۔“

آل سبکتگین کے عہد میں بڑے بڑے ارباب فضل و کمال لاہور میں آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ابو الحسن
 علی بن عثمان البجیری اور شیخ فخر الدین زنجانی جو شاہیر مشائخ صوفیہ سے ہیں اسی زمانہ میں یہاں آئے اور
 اسی جگہ انتقال فرمایا۔ ان کے مزارات آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہیں۔ مسعود سعد سلمان اور ابوالہجج
 رونی کے خاندان عرصہ سے لاہور میں آباد تھے۔ اور اسی شہر کے اطراف میں ان کی پیدائش واقع ہوئی تھی۔
 ابو عبد اللہ النکتی اور حمید الدین مسعود بن سعد شالی کو ب لاہور کے باشندے اور فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر
 تھے۔ پہلا سلطان مسعود کے زمانہ میں اور دوسرا سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں گزرا ہے۔ مشہور ادیب ابو نصر
 فارسی لاہور میں مدتوں مقیم رہا ہے۔ زمانہ قیام میں اس نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ جو صدیوں قائم رہا اور اس میں
 تعلیم جاری تھی۔

آل سبکتگین سے پہلے غزنین کی معمولی حالت تھی۔ سلطان محمود کے زمانہ میں اس کو وسعت و رونق حاصل
 ہوئی ہے۔ سلطان جب قنوج و متھرا کی مہم سے واپس آیا تو یہاں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی اور اس میں ایک مدرسہ
 بھی قائم کیا۔ اعیان و امرا نے بھی سلطان کی پیروی کی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں غزنین کا لیٹان عمارتوں اور علمی
 یادگاروں سے معمور ہو گیا۔ اور ایشیا کے عظیم الشان شہروں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ ابن رازی کا بیان ہے
 کہ سلطان محمود کے زمانہ میں غزنین کی آبادی کسی فرسنگ تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے
 ہوتا ہے کہ اس میں بارہ ہزار صرف مساجد و مدارس واقع تھے۔ وفاء عام کی دیگر عمارات ریاضات و خانقاہات وغیرہ
 کی تعداد ان کے علاوہ تھی۔ غزنین کی یہ رونق بہت کم مدت قائم رہی۔ بہرام شاہ کے زمانہ میں علامہ الدین غوری

جب اُسے فتح کیا تو جلا کر خاک کر دیا اور اسی وجہ سے اس کا لقب 'جہاں سوز' مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد غزنویں کو پھر کبھی عروج حاصل نہیں ہوا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اسے ساتویں صدی میں دیکھا تھا۔ اُس کا بیان ہے کہ صرف ایک گوشہ میں آبادی ہی بڑی ویرانہ ہے۔ اس شہر کی گزشتہ شان و شوکت کو یاد دلانے کے لئے آل سبکتگین کے آثارِ صیقل سے اس وقت صرف دو مینار باقی رہ گئے ہیں جن کو سلطان محمود اور اس کو بیٹے مسعود نے اپنی فتوحات کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا۔

آل سبکتگین کے زمانہ میں دیگر علوم و فنون کی نسبت فارسی شاعری کو خوب ترقی ہوئی ہے۔ اُس کی تفصیل کو بیان کرنے سے پیشتر فارسی شاعری کا مختصر حال تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ آئندہ اوراق میں فارسی شاعری اور شعرا کے جو حالات مذکور ہوں گے اُن پر اُس مہید سے نہ صرف روشنی پڑے گی بلکہ فارسی شاعری کا تاریخی سلسلہ بوط ہو جائے گا۔

عربوں نے جب ایران فتح کیا تو فاتحین کا اثر مفتوح اقوام میں مقناطیسی قوت کی طرح سرایت کر گیا۔ عربی مذہب اور تمدن تمام ملک میں برق و باد کی مانند پھیل گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی زبان اور اُس کے علوم و فنون ماند پڑ گئے۔ اور اُس کی عوض عربی زبان اور اسلامی علوم کی تمام ملک میں اشاعت ہو گئی۔ تیرہا دو سال تک یہی کیفیت رہی۔ خلفائے بنی عباس کو جب زوال شروع ہوا اور ایرانی حکام کی بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ تو اُن کی توجہ سے فارسی زبان میں از سر نو صحرانِ حرکت پیدا ہوئی اور ان خاندانوں کے سایہ عاطفت میں اُس کو نشو و نما ہونے لگا۔

فارسی شاعری جو اسلام سے پہلے ایران میں رائج تھی عربی فتوحات کے زمانہ میں اس طرح مٹ گئی کہ اُس وقت نہ تو اس عہد کے کسی شاعر کا نام ملتا ہے اور نہ دو چار بیت دستیاب ہوتے ہیں۔ موجودہ شاعری کی ابتدا تیسری صدی میں ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ مامون الرشید جب خراسان میں مقیم تھا تو عباس مروزی نے اُس کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں مامون نے اُسے ہزار دینار سرخ عطا کئے۔ اور ہزار درہم ساٹا اُس کی تحفہ مقرر کر دی۔ محمد غوثی کا بیان ہے کہ عہد اسلام میں یہ سب سے پہلا کلام ہے جو فارسی میں موزون ہوا۔

اُس کے بعد تھوڑی مدت تک کسی نے بھی فارسی شاعری کی طرف توجہ نہیں کی یہاں تک کہ طاہر زوایہ میں نے اپنی خود مختار حکومت خراسان میں قائم کر لی۔ یہ خاندان اور اُس کے جانشین آل صفاریں سرزمین میں حکمران تھے جہاں کی زبان فارسی تھی۔ اور اسی بنیاد پر ان کے درباروں میں بہت سی فارسی شعرا پیدا ہو گئے۔ ان میں خطلہ، فیروز مشرقی، محمود و راق اور بنجیک چنگزن بہت مشہور ہیں۔

خطلہ باغیس کا باشندہ تھا پہلے میں فوت ہوا ہے۔ فیروز کے آباؤ اجداد میں کے رہنے والے تھے۔ محمود و راق محمد بن طاہر کے زمانہ میں گزرا ہے بنجیک چنگزن جس کا نام ابوالحسن علی بن محمد ترمذی ہے، ملوک صفاریہ کا درباری شاعر تھا۔ احمد صفاری کی وجہ میں اُس نے جو قصائد لکھے ہیں وہ مجمع الفصحا میں درج ہیں۔ صفاریوں کی تباہی کے بعد اُمراء چغانیاں کے دربار میں توسل پیدا کیا اور مدت تک طاہر بن حسین چغانی کا ندیم خاص رہا ہے۔

اس وقت تک شاعری کی حالت طفل شیر خوار کے مانند تھی۔ جب سامانیوں کا زمانہ آیا تو اُس نے عہد شباب میں قدم رکھا۔ ملوک سامانیہ سلاطین ایرانی تھے بہرام چوبین سے اُن کا سلسلہ ملتا تھا۔ فارسی اُن کی مادری زبان تھی حکومت جب اُن کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے فارسی کو ترقی دینے میں شاہانہ فیاضی سے کام لیا۔ بڑے بڑے شعراء دربار میں جمع کئے اور اُن کی پیش قدمی اختیار کیا۔ ہزار ہا روپیہ صرف کر کے فارسی میں کتابیں لکھوائیں جس کا مختصر تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ سامانیوں کے دربار میں اگرچہ سینکڑوں شعرا موجود تھے۔ لیکن ان میں جن کو خصوصیت حاصل تھی اُن کے نام نظامی عروضی سمرقندی نے سببِ دل لکھے ہیں:

ابوالعباس۔ ابوالثعلب۔ ابوالاسحاق۔ ابوشکور بلخی۔ جو باری۔ ابوالحسن۔ خبازی نیشاپوری۔ شہید بلخی۔ ابوالموئید۔ ابو عبد اللہ فرلادی۔ رودکی۔ دقیقی۔ رابعہ فرداری۔ ابوذر۔ سمرج جانی۔ ابوالمظفر نصر بن محمد نیشاپوری۔ عمارہ مروزی۔ طخاری۔ مرادی۔

ان میں سے اکثر شعراء کے حالات اور کلام دونوں مفقود ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں شہید اور مرادی قدیم شاعر ہیں۔ رودکی نے ان کا مرثیہ بھی لکھا ہے جو مجمع الفصحا میں منقول ہے۔ ابوشکور بلخی اور خبازی نیشاپوری

لے مجمع الفصحا ج ۱ لے مجمع الفصحا لے مجمع الفصحا لے مجمع الفصحا لے چار مقالہ

دونوں معاصر ہیں۔ نوح بن نصر بن احمد سامانی (۳۳۲ھ-۳۴۳ھ) کے زمانہ میں گزرے ہیں پہلے کاہلۃ میں اور دوسرے کاہلۃ میں انتقال ہوا ہے۔ ابوالمؤید بلخ کا باشندہ تھا۔ اس نے حکایات یوسف زلیخا کو سب سے پہلے نظم کیا ہے سوائے اس کے اُس نے ملوک عجم کی ایک تاریخ بھی لکھی ہے جس کا نام شاہنامہ ہے اور اُس میں ایران قدیم کے حالات کمال تفصیل کے ساتھ تحریر کئے ہیں۔ عنصر المعالی کیکا دس بن اسکند بن وشمگیر نے قابوس نامہ میں اُس کا ذکر کیا ہے۔

- سامانی شعراء میں رودکی اور دقیقی کو نہایت شہرت ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انھیں کی وجہ سے سامانیوں کا نام زندہ جاوید ہو گیا ہے۔ ابو عبد اللہ محمد رودکی غنشب کے قریب رودک کا باشندہ اور نصر بن احمد سامانی کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ تمام تذکرہ نویس اُس کو فارسی شاعری کا بانی اول اور شعرا کا ابوالآبار کہتے ہیں سب سے پہلے اُس نے اپنے دیوان کو مرتب و مدون کیا ہے اُس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہے اور اُس میں تمام اصناف سخن مثلاً قصیدہ غزل قطعہ رباعی مرثیہ وغیرہ موجود ہیں۔ نصر بن احمد کے فرمایش سے اُس نے کلیلہ و منہ کی حکایات بھی نظم کی تھیں۔ لیکن مدت ہوئی کہ یہ کتاب زمانہ کے ناقدر ہاتھوں سے برباد ہو گئی ہے۔ اور اُس وقت اس کے صرف دس بارہ شعر ملتے ہیں جن کو حکیم اسدی طوسی نے اپنی لغات میں بطور شواہد کے نقل کیا ہے ۳۳۲ھ میں اُس نے وفات پائی۔

ابو منصور محمد بن احمد دقیقی سمرقند کا باشندہ ہے۔ مدت تک امرائے چغانیاں کے دربار میں رہا۔ امیر نوح بن منصور سامانی (۳۳۲ھ-۳۴۳ھ) جب تخت نشین ہوا تو دقیقی چغانیاں سے بجز را میں آیا۔ بادشاہ نے جب اُس کے کمالات کو دیکھا تو دربار کا ملک الشعراء مقرر کیا اور تاریخ ملوک عجم کو نظم کرنے کی خدمت اُس کے سپرد کی اس واقعہ کے بعد دقیقی بہت کم مدت زندہ رہا۔ ۳۴۳ھ میں اُس کے ایک غلام نے اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

سامانیوں کے بعد غزنویوں کا دور آتا ہے۔ ان کے عہد میں فارسی شاعری انتہائے شباب پر پہنچ گئی

لے مجمع الفصحا جلد ۱ لے مثنوی یوسف زلیخا فردوسی مثنیٰ یورپ لے قابوس نامہ طبع ملتان

لے تذکرہ دولت شاہ

لے تذکرہ دولت شاہ

تھی۔ سینکڑوں شاعران کے فیضان کرم سے بہرور ہوتے تھے۔ اور سرپرستی اور فیاضی کے بدولت شاعری کو بے انتہا وسعت حاصل ہو گئی۔ اور اس قدر ادبی ذخیرہ فراہم ہوا کہ اس کی تفصیل بیان کی جائے تو اس کے لئے ایک طومار کی ضرورت ہی مجمع الفصحائیں لکھا ہی ہے

چوں نوبت دولت ملوک آل ناصر غزنویہ بلند آوازہ آمد سلطان محمد بن ناصر الدین سلجوقی
دو تربیت شعراء کو شیدہ و تبیکل مستعدان عہد جد کرد۔ چنان کہ ثروت حکیم ابوالقاسم غصری
از دولت عبد اللہ البرد کی درگزشت و چهار صد تن شاعر ماهر قادر در آں والا دولت تربیت
یافتند۔ دوسے ملک الشعراء بالاستقلال و استحقاق ہمہ بود۔ و پس از سلطان محمود ذی قزندگان
وے جمعی را مری و مشوق بودند۔

نظامی عروضی سمرقندی نے شعراء آل سلجوقی کی یہ تفصیل بیان کی ہے۔ غصری، عجمدی، فرخی، برای، زیمتی، بزرجہر، قانیسی، مظفری، مشوری، منوچہری، مسعودی، قصارامی، ابو حنیفہ اسکاف، راشدی، ابوالفرج رونی، محمد ناصر، مسعود سعد سلمان، شاہ ابوجا، احمد خلف، عثمان مختاری، مجد و داسنانی۔ ان کے حالات ہم آئندہ اوراق میں موقع بہ موقع بیان کریں گے۔ اس مقام پر مختصر الفاظ میں اُن قابل لحاظ عمیرات کو بیان کرتے ہیں جو آل سلجوقی کے عہد میں فارسی شاعری میں پیدا ہوئے تھے۔

(۱) اس وقت تک فارسی شاعری کو صرف مضمون اور فن کی حیثیت سے ترقی ہوئی تھی۔ لیکن زبان شاعری نہ نئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سامانی اور غزنوی خاندانوں کے مرکز حکومت ایران سے باہر تھے۔ اور اُن کے دربار میں جو شعراء تھے۔ وہ بھی علوماً انھیں صوجات کے رہنے والے تھے۔ مثلاً رودکی، نیشابوری، نرگس کا باشندہ تھا۔ دقیقی اور عجمدی مرو کے رہنے والے تھے۔ غصری اور فرخی کے وطن بلخ و سجستان تھے ابوالفرج اور مسعود سعد سلمان کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی۔ مختاری اور سنائی کو غزنین میں نشو و نما حاصل ہوا تھا۔ آل سلجوق نے جب اس ملک پر قبضہ کیا اور اُن کی سرپرستی میں ایران میں شاعری پھیلی تو اس عہد سے زبان میں لطافت و شیرینی پیدا ہوئی اور محاورات و مصطلحات جو خاص اہل زبان کا خاصہ ہیں شاعری میں

داخل ہوئے۔

(۲) اس وقت تک شاعری کے صرف دو صنف قصیدہ و مثنوی کو رواج عام حاصل ہوا تھا۔ قصاید ہندیا سے مخصوص تھے۔ مثنوی کو شعراء نے قصص و حکایات تک محدود کر دیا تھا۔ رودکی۔ ابوالموید بنی۔ اور عتیق بنی سے مثنوی گوئی کی ابتداء ہوئی ہے۔ رودکی نے کلیلہ و منہ ابوالموید اور عتیق نے حکایات یوسف زلیخا کو نظم کیا ہے۔

شعرا آل ناصر کی جدت پند طبائع نے ان دونوں اصناف میں بہت سے جدید مضامین ادا کئے ہیں جس کی وجہ سے شاعری میں بے حد وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً شاعری کی سب سے بڑی قسم رزمیہ ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر رزمیہ نظم کو اس قدر مکمل کر دیا کہ اس پر آج تک ایک حرف کا اضافہ نہ ہو سکا۔ اسی عہد میں حکیم سنائی نے حدیقہ اور اسی قبیل کی دوسری مثنویوں کو لکھ کر اخلاقی اور صوفیانہ شاعری کا سنگ بنیاد رکھا ہے جس کی تکمیل زمانہ ابد میں شیخ عطار اور عارف روم نے کی ہے اکثر شعراء نے قصاید میں اخلاقی اور تاریخی مضامین ادا کئے ہیں۔ حکیم غصری نے ایک طولانی قصیدہ میں سلطان محمود کے تمام فتوحات کو نظم کیا اور اس کا نام فتح الخوار رکھا ہے۔ حکیم سنائی کا قصیدہ رموز الانبیاء اور کنوز الادبیا طبقہ صوفیہ میں نہایت مشہور ہے اس میں سلوک کے معارف و حقائق اور لطائف و دقائق مذکور ہیں مولانا جامی نے اس کے ابیات کی تعداد ایک سو اسی بیان کی ہے۔

(۳) اس وقت تک فارسی شاعری کے قواعد و ضوابط کی تدبیر نہیں ہوتی تھی۔ سب سے پہلے غزلیوں کے عہد میں استادان فن نے ان کو مرتب و مدون کیا ہے حکیم ہرانی سرنسی نے فن شعر کے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں۔ غایتہ العروضین اور کنز القافیہ میں علم عروض و قافیہ کے اصول و فروع جمع کئے ہیں۔ خجستہ نامہ میں نقد شعر اور اس کے اصناف و انواع کو بیان کیا ہے۔ حکیم فرخی نے علم بیان و معانی میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام

بے فردوسی نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا میں ان دونوں مثنویوں کا ذکر کیا ہے مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب ہفت آسمان جس میں مثنوی گو شعراء کے تاریخی حالات مذکور ہیں ۱۵ دولت شاہ ۱۶ نفحات الانس صفحہ ۲۹۰ ۱۷ ہرانی کی

تصنیفات اس وقت ناپید ہیں ساتویں صدی تک موجود تھیں شمس الدین قیس نے ان کو دیکھا ہے۔ اور اپنی کتاب المجسم فی معارف اشعار العجم میں ان سے مضامین اقتباس کئے ہیں ۱۸ چار مقالہ ۱۹ عونی جلد ۱

ترجمانِ البلاغت ہی۔ یہ کتابیں اُسی زمانہ میں شاعری کا نصاب مقرر ہو گئی تھیں۔ جو شخص شاعر ہونا چاہتا تھا اُسے ان کتابوں کے ذریعہ شاعری کی تعلیم حاصل کرنا لازمی امر تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی لکھتا ہی: اُن شاعر میں درجہ نرسد الاکہ در علقون شباب در روزگار جوانی بست ہزار اشعار متقدمین یا گذرد و ہزار کلمہ آثار متاخرین در پیش چشم کند و پیوستہ دوادین استادان خواندہ۔ دعروضی بخاندو گرد تصانیف استاد ابوالحسن ہر امی سرخی گردو۔ و مانند غایتہ العروضین و کثر القافیہ و نقد معانی و نقد الفاظ و سرقات و تراجم و انواع این علوم بخواند۔“

باب دوم

امیر ناصر الدین بکتگین اور اُس کے فرزند

امیر بکتگین کا مذاقِ علمی اور اس کے عہد کے اربابِ کمال ابوالفتح بستی، حکیم کمانی، مردزی، امیر بکتگین کے لڑکے، امیر اسماعیل، امیر یوسف، امیر نصر، مدرسہ سعیدیہ، دنیائے اسلام کا پہلا مدرسہ، امام ابوالنصور تعلبی، کتاب الغرر فی سیر الملوک۔

امیر بکتگین شجاع عادل عابد و زاہد اور ذی علم بادشاہ ہوا ہی۔ اشاعتِ علم سے اس کو خاص رغبت تھی۔ اپنے لڑکوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی تھی۔ اور انھیں ترویجِ علم اور اربابِ فضل و کمال کی قدردانی پر ہمیشہ آمادہ کیا کرتا تھا۔ مؤرخ فرشتہ نے ان خیاتِ خوند میر کی کتاب مآثر الملوک سے حسب ذیل واقعہ نقل کیا ہے جس سے اُس کا مذاقِ علمی ظاہر ہوتا ہی۔

”سلطان محمود نے اپنے پیامِ جوانی میں کہ جس وقت اپنے پدر والا گوہر کے ظلِ عنایت میں تھا ایک باغِ جنت نشانِ نہایت زیب و زینت کے ساتھ تیار کرایا۔ جب وہ ہر طرح سے آراستہ ہو گیا تو اپنے پدر بزرگوار اور ارکانِ دولت کو اُس کے اندر بلوایا۔ اُس وقت امیر ناصر الدین بکتگین

نے فرمایا کہ لے فرزند یہ باغ و مکان تو حقیقت میں بہت مطبوع و مقبول ہیں لیکن ہماری ملازمتیں
نے اکثر ایسے بنا سکتے ہیں سلاطین کو شایان ہے کہ ایسی عمارت اور ایسا باغ بنائیں کہ اور لوگ
مثلاً اُس کے بنانے سے عاجز آئیں سلطان محمود نے آداب بجا لاکر عرض کیا کہ وہ کیسا باغ اور
کیسی عمارت ہے۔ فرمایا کہ اہل علم و فضل کے دلوں کی تعمیر اور اُن کے دلوں کی زمین میں نہال
احسان لگانا اور غمرۂ سعادت حاصل کرنا اور تاقیامت ذکر جمیل صفحہ روزگار پر چھوڑ جانا۔^۱

امیر بکتگیں کے دربار میں اکثر اربابِ علم جمع تھے۔ اور اُس نے سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر امیر
ماورکیا تھا۔ شیخ الجلیل مجد الدین ابوالفتح بستی دربار کا میر منشی تھا۔ بکتگیں کی وفات کے بعد سلطان محمود کے
زمانہ میں بھی اُس نے دو سال تک بعض مہام سلطنت انجام دیے۔ یہ شخص علوم مقبول کا زبردست عالم ہوا
ہی۔ عربی فارسی میں اُس کے دو دیوان ہیں جو حقایق اور معارف سے مالا مال ہیں۔ ایک مطول قصیدہ ہیں
زہد و تقویٰ اور ترک دنیا کے مضامین کو بیان کیا ہے۔ یہ قصیدہ عرب و عجم میں نہایت مقبول ہوا ہے۔ اور
ملک الشعر اردبیل الدین جاجرمی نے اِس کا نظم فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ مطلع یہ ہے۔
زیادۃ المر فی دنیاہ نقصان در سبجہ غیر محض النخیر خسراں

ابوالفتح بستی نے ۷۳۳ھ میں انتقال کیا۔ ملک عماد دوزی نے اُس کی تاریخ وفات حسب ذیل
لکھی ہے۔

شیخ عالی قدر مجد الدین ابوالفتح انکہ بُو مقتدائے اہل فضل و سرور اہل کلام
چار صد باسی چو از تاریخ ہجرت در گذشت درمہ شوال طلت کرد از دار السلام
حکیم ابوالحسن الکسائی مرو کا باشندہ تھا۔ آلِ سامان کے چوتھے بادشاہ امیر نوح بن نصر کے زمانہ میں
۶۹۳ھ میں پیدا ہوا۔ عونی نے لکھا ہے کہ پچیس سال کی عمر میں اُس نے وفات پائی اِس اعتبار سے ۶۹۳ھ میں

۱۔ ترجمہ اردو تاریخ فرشتہ سہمی تختہ الملوک طبع بخیر صفحہ ۱۱ فارسی ایڈیشن مکتوبہ جلد ۱ صفحہ ۲۱ ۲۔ نیمۃ الدہر صفحہ ۲۰ و ۲۱ و ۲۳ و ۲۴ عونی
جلد ۱ صفحہ ۶ و ۷ دولت شاہ صفحہ ۲۶ و ۲۷ و ۲۸ و ۲۹ مجمع النعمان جلد ۱ صفحہ ۷۰ و ۷۱ و ۷۲ و ۷۳ و ۷۴ و ۷۵ و ۷۶ و ۷۷ و ۷۸ و ۷۹ و ۸۰ و ۸۱ و ۸۲ و ۸۳ و ۸۴ و ۸۵ و ۸۶ و ۸۷ و ۸۸ و ۸۹ و ۹۰ و ۹۱ و ۹۲ و ۹۳ و ۹۴ و ۹۵ و ۹۶ و ۹۷ و ۹۸ و ۹۹ و ۱۰۰ و ۱۰۱ و ۱۰۲ و ۱۰۳ و ۱۰۴ و ۱۰۵ و ۱۰۶ و ۱۰۷ و ۱۰۸ و ۱۰۹ و ۱۱۰ و ۱۱۱ و ۱۱۲ و ۱۱۳ و ۱۱۴ و ۱۱۵ و ۱۱۶ و ۱۱۷ و ۱۱۸ و ۱۱۹ و ۱۲۰ و ۱۲۱ و ۱۲۲ و ۱۲۳ و ۱۲۴ و ۱۲۵ و ۱۲۶ و ۱۲۷ و ۱۲۸ و ۱۲۹ و ۱۳۰ و ۱۳۱ و ۱۳۲ و ۱۳۳ و ۱۳۴ و ۱۳۵ و ۱۳۶ و ۱۳۷ و ۱۳۸ و ۱۳۹ و ۱۴۰ و ۱۴۱ و ۱۴۲ و ۱۴۳ و ۱۴۴ و ۱۴۵ و ۱۴۶ و ۱۴۷ و ۱۴۸ و ۱۴۹ و ۱۵۰ و ۱۵۱ و ۱۵۲ و ۱۵۳ و ۱۵۴ و ۱۵۵ و ۱۵۶ و ۱۵۷ و ۱۵۸ و ۱۵۹ و ۱۶۰ و ۱۶۱ و ۱۶۲ و ۱۶۳ و ۱۶۴ و ۱۶۵ و ۱۶۶ و ۱۶۷ و ۱۶۸ و ۱۶۹ و ۱۷۰ و ۱۷۱ و ۱۷۲ و ۱۷۳ و ۱۷۴ و ۱۷۵ و ۱۷۶ و ۱۷۷ و ۱۷۸ و ۱۷۹ و ۱۸۰ و ۱۸۱ و ۱۸۲ و ۱۸۳ و ۱۸۴ و ۱۸۵ و ۱۸۶ و ۱۸۷ و ۱۸۸ و ۱۸۹ و ۱۹۰ و ۱۹۱ و ۱۹۲ و ۱۹۳ و ۱۹۴ و ۱۹۵ و ۱۹۶ و ۱۹۷ و ۱۹۸ و ۱۹۹ و ۲۰۰ و ۲۰۱ و ۲۰۲ و ۲۰۳ و ۲۰۴ و ۲۰۵ و ۲۰۶ و ۲۰۷ و ۲۰۸ و ۲۰۹ و ۲۱۰ و ۲۱۱ و ۲۱۲ و ۲۱۳ و ۲۱۴ و ۲۱۵ و ۲۱۶ و ۲۱۷ و ۲۱۸ و ۲۱۹ و ۲۲۰ و ۲۲۱ و ۲۲۲ و ۲۲۳ و ۲۲۴ و ۲۲۵ و ۲۲۶ و ۲۲۷ و ۲۲۸ و ۲۲۹ و ۲۳۰ و ۲۳۱ و ۲۳۲ و ۲۳۳ و ۲۳۴ و ۲۳۵ و ۲۳۶ و ۲۳۷ و ۲۳۸ و ۲۳۹ و ۲۴۰ و ۲۴۱ و ۲۴۲ و ۲۴۳ و ۲۴۴ و ۲۴۵ و ۲۴۶ و ۲۴۷ و ۲۴۸ و ۲۴۹ و ۲۵۰ و ۲۵۱ و ۲۵۲ و ۲۵۳ و ۲۵۴ و ۲۵۵ و ۲۵۶ و ۲۵۷ و ۲۵۸ و ۲۵۹ و ۲۶۰ و ۲۶۱ و ۲۶۲ و ۲۶۳ و ۲۶۴ و ۲۶۵ و ۲۶۶ و ۲۶۷ و ۲۶۸ و ۲۶۹ و ۲۷۰ و ۲۷۱ و ۲۷۲ و ۲۷۳ و ۲۷۴ و ۲۷۵ و ۲۷۶ و ۲۷۷ و ۲۷۸ و ۲۷۹ و ۲۸۰ و ۲۸۱ و ۲۸۲ و ۲۸۳ و ۲۸۴ و ۲۸۵ و ۲۸۶ و ۲۸۷ و ۲۸۸ و ۲۸۹ و ۲۹۰ و ۲۹۱ و ۲۹۲ و ۲۹۳ و ۲۹۴ و ۲۹۵ و ۲۹۶ و ۲۹۷ و ۲۹۸ و ۲۹۹ و ۳۰۰ و ۳۰۱ و ۳۰۲ و ۳۰۳ و ۳۰۴ و ۳۰۵ و ۳۰۶ و ۳۰۷ و ۳۰۸ و ۳۰۹ و ۳۱۰ و ۳۱۱ و ۳۱۲ و ۳۱۳ و ۳۱۴ و ۳۱۵ و ۳۱۶ و ۳۱۷ و ۳۱۸ و ۳۱۹ و ۳۲۰ و ۳۲۱ و ۳۲۲ و ۳۲۳ و ۳۲۴ و ۳۲۵ و ۳۲۶ و ۳۲۷ و ۳۲۸ و ۳۲۹ و ۳۳۰ و ۳۳۱ و ۳۳۲ و ۳۳۳ و ۳۳۴ و ۳۳۵ و ۳۳۶ و ۳۳۷ و ۳۳۸ و ۳۳۹ و ۳۴۰ و ۳۴۱ و ۳۴۲ و ۳۴۳ و ۳۴۴ و ۳۴۵ و ۳۴۶ و ۳۴۷ و ۳۴۸ و ۳۴۹ و ۳۵۰ و ۳۵۱ و ۳۵۲ و ۳۵۳ و ۳۵۴ و ۳۵۵ و ۳۵۶ و ۳۵۷ و ۳۵۸ و ۳۵۹ و ۳۶۰ و ۳۶۱ و ۳۶۲ و ۳۶۳ و ۳۶۴ و ۳۶۵ و ۳۶۶ و ۳۶۷ و ۳۶۸ و ۳۶۹ و ۳۷۰ و ۳۷۱ و ۳۷۲ و ۳۷۳ و ۳۷۴ و ۳۷۵ و ۳۷۶ و ۳۷۷ و ۳۷۸ و ۳۷۹ و ۳۸۰ و ۳۸۱ و ۳۸۲ و ۳۸۳ و ۳۸۴ و ۳۸۵ و ۳۸۶ و ۳۸۷ و ۳۸۸ و ۳۸۹ و ۳۹۰ و ۳۹۱ و ۳۹۲ و ۳۹۳ و ۳۹۴ و ۳۹۵ و ۳۹۶ و ۳۹۷ و ۳۹۸ و ۳۹۹ و ۴۰۰ و ۴۰۱ و ۴۰۲ و ۴۰۳ و ۴۰۴ و ۴۰۵ و ۴۰۶ و ۴۰۷ و ۴۰۸ و ۴۰۹ و ۴۱۰ و ۴۱۱ و ۴۱۲ و ۴۱۳ و ۴۱۴ و ۴۱۵ و ۴۱۶ و ۴۱۷ و ۴۱۸ و ۴۱۹ و ۴۲۰ و ۴۲۱ و ۴۲۲ و ۴۲۳ و ۴۲۴ و ۴۲۵ و ۴۲۶ و ۴۲۷ و ۴۲۸ و ۴۲۹ و ۴۳۰ و ۴۳۱ و ۴۳۲ و ۴۳۳ و ۴۳۴ و ۴۳۵ و ۴۳۶ و ۴۳۷ و ۴۳۸ و ۴۳۹ و ۴۴۰ و ۴۴۱ و ۴۴۲ و ۴۴۳ و ۴۴۴ و ۴۴۵ و ۴۴۶ و ۴۴۷ و ۴۴۸ و ۴۴۹ و ۴۵۰ و ۴۵۱ و ۴۵۲ و ۴۵۳ و ۴۵۴ و ۴۵۵ و ۴۵۶ و ۴۵۷ و ۴۵۸ و ۴۵۹ و ۴۶۰ و ۴۶۱ و ۴۶۲ و ۴۶۳ و ۴۶۴ و ۴۶۵ و ۴۶۶ و ۴۶۷ و ۴۶۸ و ۴۶۹ و ۴۷۰ و ۴۷۱ و ۴۷۲ و ۴۷۳ و ۴۷۴ و ۴۷۵ و ۴۷۶ و ۴۷۷ و ۴۷۸ و ۴۷۹ و ۴۸۰ و ۴۸۱ و ۴۸۲ و ۴۸۳ و ۴۸۴ و ۴۸۵ و ۴۸۶ و ۴۸۷ و ۴۸۸ و ۴۸۹ و ۴۹۰ و ۴۹۱ و ۴۹۲ و ۴۹۳ و ۴۹۴ و ۴۹۵ و ۴۹۶ و ۴۹۷ و ۴۹۸ و ۴۹۹ و ۵۰۰ و ۵۰۱ و ۵۰۲ و ۵۰۳ و ۵۰۴ و ۵۰۵ و ۵۰۶ و ۵۰۷ و ۵۰۸ و ۵۰۹ و ۵۱۰ و ۵۱۱ و ۵۱۲ و ۵۱۳ و ۵۱۴ و ۵۱۵ و ۵۱۶ و ۵۱۷ و ۵۱۸ و ۵۱۹ و ۵۲۰ و ۵۲۱ و ۵۲۲ و ۵۲۳ و ۵۲۴ و ۵۲۵ و ۵۲۶ و ۵۲۷ و ۵۲۸ و ۵۲۹ و ۵۳۰ و ۵۳۱ و ۵۳۲ و ۵۳۳ و ۵۳۴ و ۵۳۵ و ۵۳۶ و ۵۳۷ و ۵۳۸ و ۵۳۹ و ۵۴۰ و ۵۴۱ و ۵۴۲ و ۵۴۳ و ۵۴۴ و ۵۴۵ و ۵۴۶ و ۵۴۷ و ۵۴۸ و ۵۴۹ و ۵۵۰ و ۵۵۱ و ۵۵۲ و ۵۵۳ و ۵۵۴ و ۵۵۵ و ۵۵۶ و ۵۵۷ و ۵۵۸ و ۵۵۹ و ۵۶۰ و ۵۶۱ و ۵۶۲ و ۵۶۳ و ۵۶۴ و ۵۶۵ و ۵۶۶ و ۵۶۷ و ۵۶۸ و ۵۶۹ و ۵۷۰ و ۵۷۱ و ۵۷۲ و ۵۷۳ و ۵۷۴ و ۵۷۵ و ۵۷۶ و ۵۷۷ و ۵۷۸ و ۵۷۹ و ۵۸۰ و ۵۸۱ و ۵۸۲ و ۵۸۳ و ۵۸۴ و ۵۸۵ و ۵۸۶ و ۵۸۷ و ۵۸۸ و ۵۸۹ و ۵۹۰ و ۵۹۱ و ۵۹۲ و ۵۹۳ و ۵۹۴ و ۵۹۵ و ۵۹۶ و ۵۹۷ و ۵۹۸ و ۵۹۹ و ۶۰۰ و ۶۰۱ و ۶۰۲ و ۶۰۳ و ۶۰۴ و ۶۰۵ و ۶۰۶ و ۶۰۷ و ۶۰۸ و ۶۰۹ و ۶۱۰ و ۶۱۱ و ۶۱۲ و ۶۱۳ و ۶۱۴ و ۶۱۵ و ۶۱۶ و ۶۱۷ و ۶۱۸ و ۶۱۹ و ۶۲۰ و ۶۲۱ و ۶۲۲ و ۶۲۳ و ۶۲۴ و ۶۲۵ و ۶۲۶ و ۶۲۷ و ۶۲۸ و ۶۲۹ و ۶۳۰ و ۶۳۱ و ۶۳۲ و ۶۳۳ و ۶۳۴ و ۶۳۵ و ۶۳۶ و ۶۳۷ و ۶۳۸ و ۶۳۹ و ۶۴۰ و ۶۴۱ و ۶۴۲ و ۶۴۳ و ۶۴۴ و ۶۴۵ و ۶۴۶ و ۶۴۷ و ۶۴۸ و ۶۴۹ و ۶۵۰ و ۶۵۱ و ۶۵۲ و ۶۵۳ و ۶۵۴ و ۶۵۵ و ۶۵۶ و ۶۵۷ و ۶۵۸ و ۶۵۹ و ۶۶۰ و ۶۶۱ و ۶۶۲ و ۶۶۳ و ۶۶۴ و ۶۶۵ و ۶۶۶ و ۶۶۷ و ۶۶۸ و ۶۶۹ و ۶۷۰ و ۶۷۱ و ۶۷۲ و ۶۷۳ و ۶۷۴ و ۶۷۵ و ۶۷۶ و ۶۷۷ و ۶۷۸ و ۶۷۹ و ۶۸۰ و ۶۸۱ و ۶۸۲ و ۶۸۳ و ۶۸۴ و ۶۸۵ و ۶۸۶ و ۶۸۷ و ۶۸۸ و ۶۸۹ و ۶۹۰ و ۶۹۱ و ۶۹۲ و ۶۹۳ و ۶۹۴ و ۶۹۵ و ۶۹۶ و ۶۹۷ و ۶۹۸ و ۶۹۹ و ۷۰۰ و ۷۰۱ و ۷۰۲ و ۷۰۳ و ۷۰۴ و ۷۰۵ و ۷۰۶ و ۷۰۷ و ۷۰۸ و ۷۰۹ و ۷۱۰ و ۷۱۱ و ۷۱۲ و ۷۱۳ و ۷۱۴ و ۷۱۵ و ۷۱۶ و ۷۱۷ و ۷۱۸ و ۷۱۹ و ۷۲۰ و ۷۲۱ و ۷۲۲ و ۷۲۳ و ۷۲۴ و ۷۲۵ و ۷۲۶ و ۷۲۷ و ۷۲۸ و ۷۲۹ و ۷۳۰ و ۷۳۱ و ۷۳۲ و ۷۳۳ و ۷۳۴ و ۷۳۵ و ۷۳۶ و ۷۳۷ و ۷۳۸ و ۷۳۹ و ۷۴۰ و ۷۴۱ و ۷۴۲ و ۷۴۳ و ۷۴۴ و ۷۴۵ و ۷۴۶ و ۷۴۷ و ۷۴۸ و ۷۴۹ و ۷۵۰ و ۷۵۱ و ۷۵۲ و ۷۵۳ و ۷۵۴ و ۷۵۵ و ۷۵۶ و ۷۵۷ و ۷۵۸ و ۷۵۹ و ۷۶۰ و ۷۶۱ و ۷۶۲ و ۷۶۳ و ۷۶۴ و ۷۶۵ و ۷۶۶ و ۷۶۷ و ۷۶۸ و ۷۶۹ و ۷۷۰ و ۷۷۱ و ۷۷۲ و ۷۷۳ و ۷۷۴ و ۷۷۵ و ۷۷۶ و ۷۷۷ و ۷۷۸ و ۷۷۹ و ۷۸۰ و ۷۸۱ و ۷۸۲ و ۷۸۳ و ۷۸۴ و ۷۸۵ و ۷۸۶ و ۷۸۷ و ۷۸۸ و ۷۸۹ و ۷۹۰ و ۷۹۱ و ۷۹۲ و ۷۹۳ و ۷۹۴ و ۷۹۵ و ۷۹۶ و ۷۹۷ و ۷۹۸ و ۷۹۹ و ۸۰۰ و ۸۰۱ و ۸۰۲ و ۸۰۳ و ۸۰۴ و ۸۰۵ و ۸۰۶ و ۸۰۷ و ۸۰۸ و ۸۰۹ و ۸۱۰ و ۸۱۱ و ۸۱۲ و ۸۱۳ و ۸۱۴ و ۸۱۵ و ۸۱۶ و ۸۱۷ و ۸۱۸ و ۸۱۹ و ۸۲۰ و ۸۲۱ و ۸۲۲ و ۸۲۳ و ۸۲۴ و ۸۲۵ و ۸۲۶ و ۸۲۷ و ۸۲۸ و ۸۲۹ و ۸۳۰ و ۸۳۱ و ۸۳۲ و ۸۳۳ و ۸۳۴ و ۸۳۵ و ۸۳۶ و ۸۳۷ و ۸۳۸ و ۸۳۹ و ۸۴۰ و ۸۴۱ و ۸۴۲ و ۸۴۳ و ۸۴۴ و ۸۴۵ و ۸۴۶ و ۸۴۷ و ۸۴۸ و ۸۴۹ و ۸۵۰ و ۸۵۱ و ۸۵۲ و ۸۵۳ و ۸۵۴ و ۸۵۵ و ۸۵۶ و ۸۵۷ و ۸۵۸ و ۸۵۹ و ۸۶۰ و ۸۶۱ و ۸۶۲ و ۸۶۳ و ۸۶۴ و ۸۶۵ و ۸۶۶ و ۸۶۷ و ۸۶۸ و ۸۶۹ و ۸۷۰ و ۸۷۱ و ۸۷۲ و ۸۷۳ و ۸۷۴ و ۸۷۵ و ۸۷۶ و ۸۷۷ و ۸۷۸ و ۸۷۹ و ۸۸۰ و ۸۸۱ و ۸۸۲ و ۸۸۳ و ۸۸۴ و ۸۸۵ و ۸۸۶ و ۸۸۷ و ۸۸۸ و ۸۸۹ و ۸۹۰ و ۸۹۱ و ۸۹۲ و ۸۹۳ و ۸۹۴ و ۸۹۵ و ۸۹۶ و ۸۹۷ و ۸۹۸ و ۸۹۹ و ۹۰۰ و ۹۰۱ و ۹۰۲ و ۹۰۳ و ۹۰۴ و ۹۰۵ و ۹۰۶ و ۹۰۷ و ۹۰۸ و ۹۰۹ و ۹۱۰ و ۹۱۱ و ۹۱۲ و ۹۱۳ و ۹۱۴ و ۹۱۵ و ۹۱۶ و ۹۱۷ و ۹۱۸ و ۹۱۹ و ۹۲۰ و ۹۲۱ و ۹۲۲ و ۹۲۳ و ۹۲۴ و ۹۲۵ و ۹۲۶ و ۹۲۷ و ۹۲۸ و ۹۲۹ و ۹۳۰ و ۹۳۱ و ۹۳۲ و ۹۳۳ و ۹۳۴ و ۹۳۵ و ۹۳۶ و ۹۳۷ و ۹۳۸ و ۹۳۹ و ۹۴۰ و ۹۴۱ و ۹۴۲ و ۹۴۳ و ۹۴۴ و ۹۴۵ و ۹۴۶ و ۹۴۷ و ۹۴۸ و ۹۴۹ و ۹۵۰ و ۹۵۱ و ۹۵۲ و ۹۵۳ و ۹۵۴ و ۹۵۵ و ۹۵۶ و ۹۵۷ و ۹۵۸ و ۹۵۹ و ۹۶۰ و ۹۶۱ و ۹۶۲ و ۹۶۳ و ۹۶۴ و ۹۶۵ و ۹۶۶ و ۹۶۷ و ۹۶۸ و ۹۶۹ و ۹۷۰ و ۹۷۱ و ۹۷۲ و ۹۷۳ و ۹۷۴ و ۹۷۵ و ۹۷۶ و ۹۷۷ و ۹۷۸ و ۹۷۹ و ۹۸۰ و ۹۸۱ و ۹۸۲ و ۹۸۳ و ۹۸۴ و ۹۸۵ و ۹۸۶ و ۹۸۷ و ۹۸۸ و ۹۸۹ و ۹۹۰ و ۹۹۱ و ۹۹۲ و ۹۹۳ و ۹۹۴ و ۹۹۵ و ۹۹۶ و ۹۹۷ و ۹۹۸ و ۹۹۹ و ۱۰۰۰

اُس کا انتقال ہوا۔ عوفی نے اس کا ایک مطول قصیدہ نقل کیا جس کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ ۳۹۱ھ میں تصنیف ہوا۔ پس یہ بات یقینی ہے کہ ۳۹۱ھ میں کسائی بقیہ حیات موجود تھا کسائی کا زمانہ شباب سکتیگن کے عہد میں گزرا ہے۔ اور سلطان محمود کا ابتدائی زمانہ بھی اپنی اخیر عمر میں دیکھا ہے۔ امیر سکتیگن کی مرح میں متعدد قصائد لکھے ہیں حکیم ناصر خسرو اس کا معاصر تھا۔ دونوں میں شاعرانہ نوک جھوک ہوا کرتی تھی۔ اس بنا پر ناصر خسرو نے اُس کے کئی قصائد کا جواب بھی لکھا ہے۔

امیر سکتیگن کے چار لڑکے تھے۔ اسمعیل، یوسف، نصر، محمود اور یہ سب عالم فاضل اور ہنر پرور تھے۔ مؤرخ ابن اثیر نے اسمعیل کی نسبت لکھا ہے کہ نیک اور فیاض آدمی تھا۔ بطم و نثر میں اُس کو اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل تھی۔ جمعہ کی نماز کے لئے جب جامع مسجد میں آتا تو اکثر اوقات اپنے تصنیف کئے ہوئے خطبے پڑھا کرتا تھا۔ ابوالمظفر یوسف بن سکتیگن کو فارسی شعر و سخن سے غایت دلچسپی تھی۔ لیبی اولیبی اس کا ذمہ خاص تھا۔ فرخی غصری اور دیگر شعرا دربار جب اس کی مرح میں قصائد لکھتے تو انہیں صلہ سبکراں دیا کرتا تھا۔

ابوالمظفر نصر۔ امیر سکتیگن کا منجھلا لڑکا تھا۔ سلطان محمود نے ۳۹۹ھ میں جب قایت کو شکست دے کر خراسان پر قبضہ کیا تو نصر کو وہاں کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اس تقریب سے نصر قریباً چھ سال تک نیشاپور میں مقیم رہا۔ ۴۱۵ھ میں جب ابراہیم نصر بن فوج سامانی کا خراسان میں استیصال ہو گیا اور ملک کے تمام فتنہ و فساد تمام ہو گئے۔ تو محمود نے نصر کو غزنین میں بلا لیا۔ نصر اس واقع کے بعد قریباً پندرہ سال تک زندہ رہا۔ ۴۱۹ھ یا ۴۲۰ھ بمقام غزنین اس کا انتقال ہوا۔ نصر کو علوم عربیہ میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اور اُن کے احباب اور نشو و تنویر میں بدرجہ غایت حصّہ لیا کرتا تھا۔ سپہ سالار کے زمانہ میں نیشاپور میں اس نے ایک عالیشان مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ جس کا نام مدرسہ سعیدیہ تھا۔ اس میں بڑے بڑے محدثین و فقہا درس و تدریس کے لئے مقرر

۱۔ ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۹۲ ۲۔ عوفی جلد ۱ صفحہ ۴۴ ۳۔ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۴۳ ۴۔ عینی صفحہ ۹۸ و ۹۹

۵۔ نصر کی تاریخ وفات کسی مؤرخ نے بیان نہیں کی ہے۔ ۶۔ عینی نے اپنی کتاب کے خاتمہ میں بلا قید تاریخ اس کا انتقال کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۸۱۰ھ کے ادال میں اختتام کو پہنچی جو اس لئے قوی گمان یہ ہوتا ہے کہ ۸۱۰ھ کے اخیر میں یا ۸۱۱ھ کے ادال میں اس نے

وفات پائی ہے۔

کے تھے تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ طلباء کی رہائش اور خورد و نوش کا بھی انتظام تھا۔ اخراجات کے لئے متعدد دیہات و قصبات وقف کر رکھے تھے۔ مؤرخین نے اس کو اسلام کے اجماع المدارس میں شمار کیا ہے۔ اور اسلامی دُنیا میں یہ پہلا مدرسہ ہی اس کے بعد بغداد مصر اور دیگر بلاد اسلام میں مدارس تعمیر ہوئے ہیں۔

امام ابوالمصور ثعلبی کی سکونت نیشاپور میں تھی۔ نصر اپنے زمانہ حکومت میں اُن کے ساتھ بے حد مراعات سے پیش آیا کرتا تھا۔ امام صاحب نے اُس کی فرمائش سے علم تاریخ میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام کتاب الغر فی سیر الملوک ہے۔ اس میں ابتدائی تخلیق عالم و آدم سے لے کر سلطان محمود کے جلوس تک جمیع اقوام عالم کے حالات کمال شرح و بسط سے لکھے ہیں۔ یہ کتاب مضامین کے اعتبار سے حسب ذیل ابواب پر منقسم ہے:

- | | |
|------------------------------|-------------------------------|
| (۱) تاریخ انبیاء علیہ السلام | (۵) تاریخ ملوک الحیمیر |
| (۲) تاریخ ملوک الفرس | (۶) تاریخ ملوک عرب الشام |
| (۳) تاریخ ملوک الفراعنة | (۷) تاریخ ملوک عرب العراق |
| (۴) تاریخ ملوک بنی اسرائیل | (۸) تاریخ ملوک الروم والافرنج |

لے تاریخ سلاطین غزنویہ و روضۃ الصفا صفحہ ۹۸ مقررہ جلد ۲ صفحہ ۶۳ سیوطی جلد ۲ صفحہ ۱۸۵ لے دنیائے اسلام میں سب سے پہلے کون سا مدرسہ قائم ہوا۔ اس عنوان پر اسلام کے ہر ادبی مؤرخ نے بحث کی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے خواجہ نظام الملک طوسی نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی ہے۔ مستشرقین یورپ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کا پہلا مدرسہ ماموں نے اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں خراسان میں قائم کیا تھا۔ لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ جرجی زیدان اور علامہ شبلی نے اس موضوع پر کس قدر تفصیل سے بحث کی ہے جو اُن کی تصنیفات میں مرقوم ہے تاریخ تمدن الاسلامی جلد ۲ صفحہ ۲۳۰ اور اسلامی مدارس منذر ج۲ وسائل شبلی صفحہ ۳۶۵ حال میں مولوی عبدالرزاق کا بنوری نے بھی نظام الملک طوسی کی سوانح عمری صفحہ (۶۴) میں مدرسہ نظامیہ کے حالات کو بیان کرتے ہوئے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے۔ ان تینوں مصنفین کا ماخذ ایک ہی اور یہ تمام معنائیں ابن خلکان مقررہ جلد ۲ سیوطی کی تصنیفات سے نقل کئے ہیں (دنیات الاعیان جلد ۱ صفحہ ۸۲ - الخطط والآثار جلد ۲ صفحہ ۳۶۳) حسن المحاضرہ جلد ۲ صفحہ (۱۶۸) و صفحہ (۱۸۵) مولوی عبدالرزاق کا مضمون چوں کہ سب کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس لئے اس میں زیادہ جامعیت ہے۔ اور اس میں قدامت و تاریخ تعمیر کے لحاظ سے مدارس کا سلسلہ قائم کیا ہی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

- (۹) تاریخ ملوک المند
(۱۰) تاریخ ملوک الترك
(۱۱) تاریخ ملوک لصین
(۱۲) سیرت جناب رسول اللہ صلم
(۱۳) تاریخ خلفائے راشدین
(۱۴) تاریخ ملوک بنی امیہ
(۱۵) تاریخ خلفائے بنی عباس
(۱۶) اخبار امراء براک
(۱۷) تاریخ ملوک طاہریہ
(۱۸) تاریخ ملوک سخریہ (آل صفار)
(۱۹) تاریخ ملوک سامانیہ
(۲۰) اخبار ملوک حمدانیہ
(۲۱) اخبار ملوک بویہ
(۲۲) اخبار امیر ناصر الدین سبکتگین

موسیو روڈنبرگ (M. Roebing) نے اس کتاب کے باب دوم کچھ میں قدیم شاہان ایران کے حالات ہیں، مسئلہ میں بمقام پیرس چھپوایا ہے اس کے ساتھ فرانسیسی ترجمہ بھی ہے جس کا عنوان یہ ہے: ”کمال کتاب نایاب مس کا ایک نفیس نسخہ فرانس کے کتب خانہ ملی میں محفوظ ہے“

(بقیہ صفحہ سابق) الحاکم بامر اللہ نے مسئلہ میں ایک مدرسہ مصر میں تعمیر کرایا یہ سب سے پہلا مدرسہ جو سلطنت کی طرف سے رہایا کے لئے قائم ہوا ہے۔ اس کے بعد نیشاپور کے باشندوں نے ایک مدرسہ قومی چندہ سے امام ابو بکر فورک المتوفی مسئلہ کے لئے قائم کیا۔ اُس کے بعد نیشاپور میں ایک اور مدرسہ بھتیقہ قائم ہوا۔ اس کے مدرس اعظم امام ابو القاسم اسکاف تھے۔ بعض مؤرخوں نے اس کو اسلامی دنیا کا پہلا مدرسہ لکھا ہے۔ مسئلہ میں سلطان محمود نے غزنین میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ محمود کی تقلید میں نصر بن سبکتگین نے بھی نیشاپور میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا اور مدرسہ سعید یہ اس کا نام رکھا۔ اُس کے بعد نیشاپور میں ایک اور مدرسہ امام ابو اسحق اسفرائینی المتوفی مسئلہ کے لئے قائم ہوا۔ جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ مدرسہ نظامیہ میں طلباء کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نوعیت کے لحاظ سے یہ پہلا مدرسہ ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصر کا مدرسہ مسئلہ کے بعد تعمیر ہوا ہے۔ اگرچہ کسی مؤرخ نے اس کی تاریخ تعمیر صراحت کے ساتھ بیان نہیں کی ہے۔ تاہم اس پر سب متفق ہیں کہ نصر نے اُس کو اپنی سپہ سالاری کے زمانہ میں جب کہ وہ نیشاپور میں رہا کرتا تھا تعمیر کرایا ہے۔ مؤرخ متی نصر کا ہم عصر ہے اُس کی تصریحات سے ظاہر ہے کہ ۳۵۹ھ سے ۳۶۵ھ تک قریباً (۶ سال) چھ سال نیشاپور میں اس کا قیام رہا ہے۔ اس بنیاد پر اس کی تاریخ تعمیر یعنی ۳۵۹ھ سے پیشتر ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ مدرسہ نہ

باب سوم

سلطان محمود بن سبکتگین

محمود کی علمی قابلیت، غزنین کی جامع مسجد مدرسہ اور کتب خانہ محمود کے دربار میں ارباب کمال کی قدر و منزلت، خوارزم کا خاندان، مونیہ محمود کی علمی فیاضیاں۔

سلاطین آل سبکتگین میں سلطان محمود سب سے زیادہ عالم و فاضل بادشاہ تھا۔ علامہ ابنی الوفا قریشی المتوفی ۷۷۰ھ نے اسے ائمہ فقہاء میں شمار کیا ہے۔ اس نے اس زمانہ کے بڑے بڑے اعیان علم، و ائمہ فن سے علوم شرعیہ کو تحصیل کیا تھا۔ حدیث فقہ میں اُس نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں منجملہ اُن کے ایک کتاب التفرید نہایت مشہور ہے اور فقہ احناف کی کتب مستندہ میں شمار ہوتی ہے۔ اُس میں ساٹھ ہزار مسائل مذکور ہیں۔ محمود کو شعر و سخن سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا۔

سلطان محمود دہلی میں جب متھر کی فتح سے واپس آیا تو غزنین میں ایک جامع مسجد سنگ مرمر درخام سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) نہ صرف نیشاپور و غزنین کے مدرسوں سے قدیم ہے بلکہ مصر کے مدرسے بھی پانچ سال پہلے تعمیر ہوا ہے۔ مدرسہ مصر اور نظامیہ کی جو خصوصیات مؤرخین نے بیان کی ہیں۔ وہ بھی اس میں جمع تھیں۔ یعنی یہ کہ حکومت کی طرف سے اس کا افتتاح ہوا ہے۔ طلباء کو مفت تعلیم دی جاتی۔ اور اُن کے رہنے کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ ان تمام وجوہات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ دعویٰ درجہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ ”نصر کا مدرسہ سعید یہ ہر اعتبار سے اسلامی دنیا کا پہلا مدرسہ ہے۔“

۱۵ جواہر المفید جلد ۲ کشف الظنون ۱۵ موسیو شیفر (M. S. Sheif) نے اپنی کتاب منتخبات فارسی کی جلد

دوم صفحہ ۲۵۰ میں جس کا نام کریمائی دی پرسان ہے محمود نامہ کو سلطان محمود سے منسوب کیا ہے۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے محمود نامہ محمود کی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ اُس کو کسی نامعلوم الاسم شاعر نے ساتویں صدی میں یا اُس کے بعد تصنیف کیا ہے اس میں سات غزلیں ہیں اور اس میں محمود کا عشق ایاز کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے اس کو محمود نامہ کہتے ہیں

ایضی صفحہ ۹۶۶ نمبر ۱۶۶

بنوائی اور اُسے انوع و اقسام کے ساز و سامان سے مزین کیا کہ سیاح اُسے دیکھتے تو عروس فلک کما کرتے تھے۔ مسجد کے پاس ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا۔ اُس میں کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں نفیس نامہ و کتابیں جمع کیں مدرسے کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کئے۔ بادشاہ کی تعلیم تمام امرانے کی اور اُن لوگوں نے بھی اس قدر مساجد مدارس اور رباطات بنوائے کہ تھوڑی ہی مدت میں غزنین عایشان عمارت اور علمی درس گاہوں سے معمور ہو گیا۔

سلطان محمود چوں کہ خود ذی علم اور زبردست عالم تھا اس لئے ارباب فضل و کمال کی خوب قدرو منزلت کرتا تھا۔ قابل آدمیوں کو اطراف عالم سے بلا کر اپنے دربار میں جمع کیا تھا۔ اور سلطنت کے عہد ہائے طویلہ اُن کے تفویض کئے تھے۔ بقول مؤرخ فرشتہ کے اس کے دربار میں ارباب کمال کا اس قدر جمع تھا کہ ہندوستان میں کسی بادشاہ کے زمانہ میں نہیں ہوا۔ ^۱ محمد اللہ مستوفی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

ماثر ادا از آفتاب روشن ترست و سامعی او در روزگار دین از شرح و وصف متغنی۔ کتاب

یمینی مقامات ابو نصر شکان و مجلدات ابوالفضل شیبانی شاہد حال اوست علماء و شعرا را دست

دستی و در حق ایشان عطاے جزل فرمودی۔ ہر سال زیادت از ہزار صد ہزار دینار اور

بدین جماعت صرف شدی۔^۲

سلطنت ہائے اسلامیہ میں وزارت کتابت و تصانیف سفارت بڑے اور جلیل القدر عہدے ہوا کرتے تھے۔ سلطان محمود نے ان خدمتوں پر بڑے بڑے عالم آدمیوں کا معمور کر رکھا تھا۔ احمد بن یحییٰ وزیرت پر ہموں تھا۔ ابو نصر شکان کا تہ تھا۔ امام ابو محمد عبد اللہ بن حسن الناصحی قاضی القضاۃ تھے۔ امام ابو طیب سیب بن سلیمان صعلوکی اور امام ابو منصور غلبی کو بھی دربار سلطنت گماں تعلق تھا اور دیگر سلاطین کے درباروں میں سفیر مقرر ہو کر جایا کرتے تھے۔

خوارزم کے شاہان مامونہ بڑے علم دوست اور ہنرمند بادشاہ گزرے ہیں ان کے دربار میں حکیم

۱۔ فرشتہ جلد صفحہ ۳۰ ۲۔ فرشتہ جلد صفحہ ۲۲ ۳۔ تاریخ گزیدہ صفحہ ۳۹۵ ۴۔ خوارزم کا خاندان مامونہ جس کو خوازم

(۱) ابو نصر شکان

شاہان قدیم ہی کہتے ہیں ابتدا میں سلاطین سامانیہ کا باج گذارتھا جب سلطنت سامانیہ تباہی کے قریب ہو گئی اور سلاطین آل سلجوق

طیب بنجہم محدث فتی شاعر غرض کہ ہر علم و فن کے صاحب کمال جمع تھے سلطان محمود خوارزم کو فتح کر کے
 شہنشاہ کے موسم بہار میں واپس آیا تو وہاں کے تمام ارباب فضل و کمال کو بھی اپنے ساتھ غزنین میں لایا۔ ان میں
 مشہور طبیب اور فیلسوف ابوالخیر خوارزمی اور یحییٰ بن ابی اسحاق البیرونی تھے۔ غزنین میں آنے کے بعد سلطان نے ان لوگوں
 کی خوب قدر دانی کی خصوصاً ابوالخیر خوارزمی کے ساتھ مراعات بیغایات سے پیش آیا۔ بیہقی نے ابوالخیر کے حالات
 میں لکھا ہے: ”سلطان محمود با اودر نہایت اکرام و غایت تجلیل اختیار نمود و بحدیکہ گویند زمین را در مقابل او بوسیہ
 محمود کو فارسی شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں چار سو شاعر تھے۔ غصری کو ملک اشعرا
 کا خطاب ملے کر ان کا افسر مقرر کیا تھا۔ اور حکم ملے رکھا تھا کہ تمام شعراء دربار میں اپنا کلام سناتے سے پہلے
 غصری سے اصلاح لے لیا کریں۔ ان شعراء میں غصری۔ عسکری۔ عسکری۔ ارشدی۔ فرخی۔ فردوسی وغیرہ
 (بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کو نشو و نما ہونے لگا۔ یعنی شہنشاہ ۳۸۸ھ اور ۳۸۹ھ کے مابین کچھ عرصہ کے لئے یہ بادشاہ خود مختار ہو گئے۔ لیکن ان کی یہ خود
 مختاری زیادہ مدت تک قائم نہیں رہی شہنشاہ ۳۹۰ھ میں سلاطین آل بکتگیں نے ان کو اپنے زیر اثر کر لیا۔ یہ امر بھی تک تحقیق نہیں ہوا
 کہ اس خاندان کی بنیاد کس زمانہ میں پڑی ہے تاہم شہنشاہ سے ان کا نام تاریخ میں آیا ہے۔ مامون بن محمد خوارزم شاہ ابتدا میں جرجانہ
 کا والی تھا۔ شہنشاہ ۳۹۰ھ میں ابو عبد اللہ والی کات کو شکست دے کر اس کے علاقہ پر متصرف ہو گیا۔ اس فتح سے خوارزم کا تمام علاقہ
 مامون خوارزم شاہ کے قبضہ میں آ گیا (ابن اثیر حوادث شہنشاہ ۳۹۰ھ)

شہنشاہ ۳۹۰ھ میں مامون نے وفات پائی اور اس کی جگہ علی بن مامون بن محمد خوارزم شاہ تخت نشین ہوا۔ اور سلطان محمود کی بہن سے
 عقد کیا جس کی وجہ سے دونوں بادشاہوں کے درمیان رشتہ اتحاد قائم ہو گیا (ابن اثیر حوادث شہنشاہ ۳۹۰ھ) اسی کے زمانہ میں شیخ الرئیس
 بوعلی سینا خوارزم میں آیا تھا۔ اس نے اس کی بدرجہ غایت قدر دانی کی تھی۔ (تقطعی صفحہ ۲۱۷)۔ ابن ابی اصیبعہ جلد ۲ صفحہ ۴۵۔
 علی بن مامون کے بعد اس کا چھوٹا بھائی ابوالعباس مامون بن محمد خوارزم شاہ بر سر حکومت ہوا۔ اور اپنے بھائی کی بیوہ
 جو سلطان محمود کی بہن تھی نکاح کر لیا۔ بڑا علم و دست اور ہنر پرورد بادشاہ ہوا۔ ابوالکسین احمد بن محمد سیسی جو مشہور فقیہ ہے اس کا وزیر اعظم تھا۔
 امرا خوارزم نے شہنشاہ سے قتل کر دیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۲ سال کی تھی (ابن اثیر حوادث شہنشاہ ۳۹۰ھ) تاریخ بیہقی (۴۰۰)

ابوالعباس مامون بن مامون کے بعد علی بن مامون کا لڑکا ابوالحارث محمد بن علی بن مامون خوارزم شاہ حکمران ہوا۔ سلطان محمود نے
 مامون بن مامون کی خون خواہی کے بدلے سے خوارزم پر یورش کی اور جب یہ ملک فتح ہو گیا تو عجب کبیر التون تاش کو وہاں کا گورنر مقرر کر کے
 شہنشاہ کے موسم بہار میں غزنین کو واپس آیا۔ خوارزم میں جس قدر ارباب کمال جمع تھے۔ ان سب کو اپنے ہمراہ غزنین میں لایا (ابن اثیر حوادث شہنشاہ ۳۹۰ھ)

خاص امتیاز رکھتے تھے۔ اور دربار کے سب سے زیادہ کھلاتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہو کہ امیر مسعود بن محمود دہم خراسان سے قلعہ ہوکرخزن میں آیا تو اُس کی تنیت میں شعراء نے قصائد لکھے۔ محمود نے ہر ایک شاعر کو بیس ہزار درہم اور غصری و رینبی کو پچاس ہزار دینار عنایت کئے۔ محمود کی فرمائش سے غصاری نے ایاز کی تعریف میں ایک رباعی لکھی جس کے صلہ میں سلطان نے دو ہزار دینار عطا کئے۔ اُس کے بعد غصاری نے ایاز کی تعریف میں ایک غزل پڑھی جو سلطان کو پسند آئی۔ اور صلہ کو المصنّف کر دیا۔ اس عنایت کے شکر یہ میں غصاری نے ایک مطول قصیدہ لکھا جس کے بعض ابیات یہ ہیں :

اگر کمال بجاہ اندرست و جاہ بہ مال	مرابیں کہ سہی جمال را بہ کمال
صواب کرد کہ سپیدانہ کرد ہر دو جہاں	یگانہ ایزد وادار بے نظیر و ہاں
وگر نہ ہر دو جہاں را کف تو بخشیدی	امید بندہ نمازی بایزد و متعال
مراد و بیت بفرمود شہسایہاں	براں صنوبر عنبر عذار مشکیں خاں
دو بد رہ از بغر ستاد ہر ہزار تمام	بزعم حاسد بجاہ باد بال و کال
چگفت حاسد ناگس کہ بدنگال من ست	ز راہ باطن و در آشکار و بینک گال
دو بد رہ یافتی از نعمت و کرامت شاہ	غنی شدی و گرا از جور و زگار منال
ہلی دو بد رہ دینار یافتہ بہ تمام	حلال و پاکتر از شیردایہ اطفال
ہزار بود و ہزار دیگر ملک افزود	بیک غزل کہ زمین خواست بر لطیف غزال

جب یہ قصیدہ سلطان کے ملاحظہ میں پیش ہوا تو سلطان نے اُس کے صلہ میں چودہ ہزار درہم پھر عنایت کئے۔ اس عطیہ بیکراں کو دیکھ کر غصری نے بے حد بیچ و تاب کھایا اور اس قصیدہ کے جواب میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے :

خدا یگان خراساں و آفتاب کمال
کہ وقت کرد برو ذوالجلال عزوجل
سلطان نے غصری کو بھی اُسی قدر قسم سرفراز کی۔

۱۔ غصاری کو جو عطیات ملے ہیں اُن کی تفصیل خزانہ عامرہ میں مذکور ہے۔

ایک دن مجلس عشرت میں سلطان محمود کو بے حد خمار زیادہ ہو گیا اور حالت سرور میں ایاز پر نظر پڑی اس کے چہرہ پر ہنسی پھیلنے لگی اور ایاز کا کبھی ہنسی نہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابر میں ماہتاب چمک رہا ہے۔ سلطان کے جوش عشق کو غلبہ ہوا لیکن زہد و تقا نے قدم روک دیے۔ اور ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں قطع کر دے۔ اُس نے اسی وقت تعمیل کی صبح جب نشہ فرو ہو گیا اور ایاز کا چہرہ دیکھا تو سخت پشیمان ہوا۔ اور طبیعت اس درجہ ملکہ رہ گئی کہ تمام ندامت و توبہ کی کیفیت دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ حاجب بزدک علی قریب نے عنصری سے تمام واقعہ بیان کیا۔ عنصری نے سلطان کے سامنے جا کر یہ رباغی پڑھی۔

کے عیب سر زلف بت از کاستن بہت چہ جائے بہ غم نشستن و خوشستن بہت

جائے طرب و نشاط وے خوشستن بہت کار استن سرور پیر استن است

یہ اشعار سلطان کو بے حد پسند آئے اور حکم دیا کہ تین بار عنصری کا منہ جو اہرات سے بھر جائے۔

اس کے میں سلطان محمود نے قلعہ کالجنگر کا محاصرہ کیا تو وہاں کے راجہ نند نے ۳۰۰ ہاتھی لے کر صلح کر لی۔

اور ہندی زبان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھ کر سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔ دربار ہند اور عرب و عجم کے جو علماء

انھیں سلطان نے یہ قصیدہ سنایا سبھوں نے اُس کی تعریف و توصیف کی تو سلطان نے اس کے صلیب میں نند کے

تمام علاقے واپس کر دیئے۔ اور علاوہ اس کے چودہ قلعوں کو اپنی طرف اُسے دیدیا۔

باب چہارم

دربار محمود کے ارباب فضل و کمال

فضل بن احمد اسفرائینی احمد بن حسن ممیندی ابو نصر شکان۔ ابو نصر عینی اور اُس کی تاریخ۔ امام ناصحی

امام مصلوکی۔ ایک خاں۔ امام غلبی حکیم ابو الخیر خمار۔ حکیم ابو ریحان بیرونی۔

ابوالعباس فضل بن احمد اسفرائینی۔ ابتدائیں سلاطین سامانیہ کا کاتب تھا۔ امیر ناصر الدین بکتلیکین نے اس کے

لے محمود دیا اسکے اس قسم کے بے سرو پا قصوں کی مولیٰ محسو دیشرائی نے اپنے مضامین میں جو اردو میں شائع ہو کر ہیں نہایت تحقیق سمجھ دیکر دی ہیں اور

لے چار مقالہ صفحہ ۴۴ و ۴۵۔ لطائف الطوائف ۳۵ فرشتہ صفحہ ۷۱ طبقات اکبری صفحہ ۹۵ شرح مینی صفحہ ۱۵۶ و ۱۶۵ تاریخ گزیدہ

صفحہ ۸۴ شاہنامہ صفحہ ۹۰ فرشتہ جلد ۱ حبیب الیر

اپنا وزیر بنایا۔ سبکتگین کے بعد محمود نے بھی اپنے ابتدائی زمانہ میں اس کو خدمت وزارت پر بحال رکھا۔ قریباً آٹھ سال اس نے وزارت کی شہسوار میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ اس کو مورجہا بنانی میں خوب قیمت تھی۔ ایرانی نسل تھا۔ اس لئے ایرانی لٹریچر اور فارسی زبان سے رغبت تمام رکھتا تھا۔ پہلے سلطنت کو احکام و توقیعات عربی میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن اُس نے عربی کے بجائے انھیں فارسی میں لکھنے کا حکم دیا۔ فردوسی جب شاہنامہ لے کر طوس سے غزنین میں آیا تو اُس نے دربار میں اُس کی تقریب کی۔ اس کی اولاد سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکے کا نام حجاج تھا۔ وزیر رشید نے جامع التواریخ میں اُن کی نسبت لکھا ہے کہ:-

”ابوالعباس پیری دشت حجاج نام کہ در فضائل کسب نفسانی سرآمد آں دیار بود و اشعار بی درغایت بلاغت نظم میفرمود و دختری نیز داشت کہ در علم حدیث مارت بے نہایت پیدا کرد چنانچہ بعضے از محدثان از دی حدیث روایت کنند“

شمس الدین ابوالقاسم احمد بن حسن میمنہ علی سلطان محمود نے اس کا ابتدا میں خراسان کا دیوان رسائل مقرر کیا تھا۔ فضل بن احمد کی معزولی کے بعد وزارت سے فایض ہوا۔ بلند پایہ اور زبردست عالم ہوا۔ عربی فارسی میں شعر خوب کہا کرتا تھا۔ امام ابوالمنصور غلی نے یتیمتہ الدہریں اُس کے عربی اشعار نقل کئے ہیں۔ اس نے اٹھارہ سال وزارت کی۔ اس کے بعد سلطان نے اس خدمت سے معزول کر کے قلعہ کالنجریں قید کرایا۔ تیرہ برس اُس نے قید میں گزارے۔ مسعود کے زمانہ میں رہائی حاصل کی پھر وزارت سے سرفراز ہوا۔ سلطنت میں انتقال کیا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ احمد کا باپ حسن میمنہ علی سلطان محمود کا وزیر تھا۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے حسن میمنہ علی امیر ناصر الدین سبکتگین کے زمانہ میں گذرا ہے۔ امیر سبکتگین نے جب قصبہ بست کو فتح کیا تو وہاں ضبط اموال کے لئے اُس کا تقرر ہوا۔ لیکن خیانت کرنے کی وجہ سے امیر نے اُس کو قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ سلطان محمود کے تحت نشین ہونے سے پہلے واقع ہوا ہے۔

ابونصر بن مشکانؒ مشہور و معروف ادیب ہی۔ اُس نے علم ادب میں المقامات کے نام سے ایک بے نظیر کتاب لکھی ہے۔ مشہور مؤرخ ابوالفضل بیہقی اُس کا شاگرد تھا۔ سلطان محمود کے زمانہ میں بھی دیوان رسالت کا عمدہ اسی سے وابستہ تھا۔ مسئلہ میں بزمانہ سلطان محمود اس کا انتقال ہوا۔

ابونصر محمد بن عبد الجبار العتبیؒ مشہور ادیب ہی۔ سلطان محمود کے اہل دربار سے تھا۔ سلطان جب برسر حکومت ہوا تو اسے ہم کر حبان پر روانہ کیا۔ اُسی دوران میں کچھ عرصہ کے لئے گنج رشتاق میں صاحب البر بدھ گیا پھر غزنین میں آکر دربار میں رہنے لگا۔ مسئلہ میں اس نے امیر ناصر الدین سلجوقی اور سلطان محمود کی تاریخ لکھی ہے جو عینی کے نام سے مشہور ہے۔ اور بلحاظ انشاء کے اس کی عبارت اس قدر فصیح و بلیغ ہے کہ علمائے ادب اُسے مقامات ہمدانی اور حریری کے ہم پایہ قرار دیتے ہیں۔ احمد امینی المتوفی ۱۲۸۰ھ نے اُس کی شرح لکھی ہے اور اس میں اُس کے تمام لغات مشککہ کو حل کیا ہے۔ یہ مشرح فتح الوہبی کے نام سے مسئلہ میں بولاق میں چھپ گئی ہے یعنی کوڈاکٹر اسپرنگر (Kodak Springer) نے ۱۲۸۰ھ میں دہلی میں چھپوایا ہے۔ اور پروفیسر نولڈ کی (Noldke) نے جرمن میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ جو مسئلہ میں بمقام دیاناشیل ہوا ہے۔

آذربائیجان کے بادشاہ اتابک ابوبکر محمد بن ایلدگز (۱۱۹۱-۱۲۲۵ھ) کے زمانہ میں وزیر مہذب الیزہ ابوالقاسم علی بن الحسین کی فرمائش سے ابوالشرف ناصح بن طغر بن سعد البحر بادقانی نے یعنی کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ جربادقان جسے اہل فارس گل بایگان کہتے ہیں علاقہ ہمدان میں اصفہان کے قریب واقع ہے۔ عربی کتاب کی بہ نسبت اس فارسی ترجمہ نے زیادہ شہرت و قبولیت حاصل کی ہے۔ زمانہ مابعد میں ایرانی مؤرخین نے فضل حمد اللہ مستوفی احمد غفاری میر خوند، خوند میر، فرشتہ وغیرہ نے اسی ترجمہ سے امیر سلجوقی اور محمود کے حالات نقل کئے ہیں۔ یہ ترجمہ مسئلہ میں بمقام طہران طبع ہو گیا ہے۔ اس ترجمہ سے درویش حسن ترکی میں اور جیمز رینالڈ نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ انگریزی ترجمہ اور نیل ٹرانسلیشن فنڈ کے سلسلہ میں ۱۲۸۰ھ میں لندن میں چھپا ہے۔

ابن اثیر حوادث المسند صلاح الدین صفوی نے الوانی بالوفیات میں اس کے مفصل حالات لکھے ہیں۔ امام غزالی نے تہذیب میں اس کے عربی کلام کو نقل کیا ہے۔ روضۃ القفار جلد ۴ صفحہ ۹۰۔ حبیب الیہ طبقات نامہ صری ترجمہ رپورٹی جلد ۸۶ صفحہ ۸۶ حاجی خلیفہ جلد ۴ صفحہ ۵۱۔ ایلٹ ہسٹری جلد ۲ صفحہ ۱۴۱۔ ریبو جلد ۱ صفحہ ۱۵۰۔ رسالہ رائل ایشیائی سوسائٹی ۱۲۸۰ھ صفحہ ۲۲۔

امام ابو محمد عبدالعزیز بن حسین الناصبیؒ تفسیر حدیث فقہ کے زبردست عالم اور مذہب خفیہ کے امام وقت مانے جاتے تھے۔ سلطان محمود اور مسعود کے زمانہ میں مدت مدید تک قاضی القضاۃ کے عہدہ جلیلہ پر مامور رہے ہیں۔ شمس کے میں فرج زاد کے زمانہ میں ان کا انتقال ہوا۔

شمس کے میں علماء فضلہ اور دیگر اہل اسلام کی ایک جماعت کثیر نے سلطان محمود سے عرض کی کہ اعراب اور قرامط کی وجہ سے بیت اللہ کا راستہ مسدود ہو گیا ہے۔ ان کے خوف اور خلفا کے خلعت سلیمان ایک عرصہ سے حج و زیارت بیت اللہ سے محروم ہیں۔ سلطان نے قاضی صاحب کو امیر حجاج بنا کر غزنین سے حاجیوں کا ایک قافلہ روانہ کیا زاد راہ کے لئے تیس ہزار دینار دیئے۔ یہ قافلہ مناسک حج ادا کرنے کے بعد ایک سال کے اندر خیر و خوبی سے واپس آیا۔

امام ابو طیب نسیم بن سلیمان صعلوکیؒ تفسیر حدیث فقہ ادب کلام میں امام وقت اور نیشاپور کے قاضی القضاۃ تھے۔ ائمہ حدیث نے ان کو شیخ خراسان اور شمس الاسلام کے لقب سے یاد کیا ہے۔ خراسان کے فقہا اگر کسی مسئلہ میں اختلاف کرتے تو فیصلہ آخر کے لئے وہ مسئلہ ان کے یہاں پیش ہوتا تھا۔ انھوں نے شمس کے میں بمقام نیشاپور وفات پائی ہے۔ شمس کے میں ایک لکھ خاں نے جب آل سامان کا خاتمہ کر دیا تو مملکت سامانیہ کے بارے میں ایک لکھ خاں اور سلطان محمود کے مابین یہ قرار پایا کہ ماوراء النہر پر ایک خاں کا اور خراسان پر محمود کا قبضہ رہے۔ اس تصفیہ کے

لے جواہر المصنوعہ جلد ۱ ص ۱۲۱ ابن اثیر جلد ۹ ص ۲۶۹ فرشتہ جلد ۵ ص ۳۵ مفتاح السعاده جلد ۲ ص ۱۸۲

لے ایک لکھ خاں۔ مؤرخین نے ماوراء النہر کے بادشاہ کا نام ایک لکھ خاں لکھا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ نام شخص خاص کا نہیں بلکہ خاندان کا لقب ہے۔ اس خاندان کے حالات کسی مؤرخ نے مستقل عنوان کے تحت میں نہیں لکھے ہیں۔ ابن اثیر ابن خلدون۔ منہاج سراج۔ وزیر رشید الدین وغیرہ نے اپنی تاریخوں میں مختلف مقامات پر اس خاندان کے حالات دوسرے سلاطین کے تحت میں لکھے ہیں اور ائمہ بخاری نے جہاں آراء ان کے حالات ایک طحہ باب میں لکھے ہیں۔ لیکن وہ نہایت مختصر ہیں حال میں سرمنبری ہوارٹ نے مؤرخین عرب کی تصنیفات سے ان کے پیغمبروں اس کے متعلق لکھا ہے جو نہایت مکمل اور معلومات مفیدہ سے ملو ہے۔

مؤرخین ان بادشاہوں کو خوانین ایک خانیہ کے علاوہ آل افراسیاب بھی کہتے ہیں۔ یہ بتانا غیر ممکن ہے کہ کس زمانہ میں اس خاندان کا ظہور ہوا۔ لیکن چوتھی صدی کے اخیر یا م سے تاریخ میں اس کا ذکر ملتا ہے اور اہل زمانہ میں (۱۰۰۰) (۱۰۰۰) (۱۰۰۰)

بعد سلطان محمود نے امام صاحب کو سفیر بنا کر ایک خاں کے پاس روانہ کیا۔ بے شمار تحفہ و ہدایا کے ساتھ اپنی لڑکی بھی ان کے ہمراہ کر دی۔ تاکہ ایک خاں کے ساتھ امام صاحب اس کا عقد کر دیں۔ امام صاحب جب ترکستان میں پہنچے تو ایک خاں نے ان کی بے حد تعظیم و تکریم کی اور کچھ عرصہ کے بعد امام صاحب فائز المرام ہو کر اور گندمی واپس تشریف لائے۔

امام ابو المنصور عبد الملک محمد بن اسماعیل الثعلبیؒ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے مصنف اور ادب اور تاریخ میں امام وقت مانے جاتے تھے۔ ششہ میں بمقام نیشاپور پیدا ہوئے۔ اور ششہ میں بمقام غزنین انتقال کیا۔
موسیو زوٹن برگ (M. Zottinburg) نے کتاب الغر فی اخبار ملوک الفرس کے دیباچہ میں ان کے مفصل حالات لکھے ہیں امام صاحب کی بعض مشہور تصنیفات کے نام یہ ہیں۔ لطائف المعارف، سحر البلاغۃ، نقۃ اللہ، النہایہ فی الکناہیہ، کتاب الغر، تیمیۃ الدہر، وغیرہ امام صاحب کو دربار آل سبکتگین سے خاص تعلق تھا۔ انہوں نے کتاب الغر امیر نصیر بن سبکتگین کی فرمائش پر تصنیف کی یہ تیمیۃ الدہر تھم کو سلطان مسعود کے نام پر ڈیڑھ لکھت کیا ہوئے ششہ میں سلطان محمود کی طرف سے سفیر ہو کر خلافت بغداد میں تشریف لے گئے۔ تاکہ سلطان کے لئے خطاب حاصل کریں۔ امام صاحب نے کل ایک سال بغداد میں قیام فرما کر اس بارے میں کوشش کی۔ تب خلیفہ نے سلطان کو یمن المدوہ دلی امیر المؤمنین کا خطاب دے کر اس کے بموجب احکام منافیہ صادر کئے۔

(قبیلہ یمن سابق) کا شغران کا مستقر تھا۔ آل سامان سے جب درالہنر کو لے لیا تو بخارا کو بعد مقام قرار دیا۔ ان کی حکومت بلاد ترکستان میں سرحد چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ مؤرخین نے بغرا خاں کو اس خاندان کا پہلا بادشاہ بتایا ہے۔ بقول ایثرس کا نام ہارون بن سلیمان ابو القب شہاب الدولہ تھا۔ ششہ میں اس نے وفات پائی ہے (ابن اثیر حوادث ششہ)۔

بغرا خاں کے بعد جو بادشاہ تخت نشین ہوا۔ اس کا نام ابن اثیر نے ابو نصر احمد بن علی لکھا ہے۔ لیکن صحیح نام نصر بن علی ہے اور اس کا بہترین ثبوت اس کے سکرات ہیں جن پر اس کا نام (ناصر الحق نصر ایک) یا نصر بن علی ایک، نقش ہے اس نام کے سکے ششہ سے سنہ ۵۱۸ھ تک مسلسل دس سال کے دستیاب ہوئے ہیں یہ ہی نصر بن علی سلطان محمود کا معاصر تھا۔ اسی کے دربار میں امام مصلوکی سفیر ہو کر تشریف لے گئے تھے۔ تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس نے ششہ سے سنہ ۵۱۸ھ تک قریباً بیس سال حکومت کی ہے۔ لیکن ہمارے اس کے خلاف یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بادشاہ ششہ تک بقید حیات موجود تھا۔

لے عینی طبع دہلی صفحہ ۵۰ ترجمہ صفحہ میر خوند سلاطین غزنویہ صفحہ ۲۲ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۲۳ ۵۰ ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۹۲ مفتاح السعاده جلد ۱ صفحہ ۴۱۳ و ۲۱۴ و ۱۸۴۔ دولت شاہ صفحہ ۳۲ برکھان جلد ۱ صفحہ ۲۸۴ و ۲۸۵

امیر الخیر حسن بن النخار اسلام کے دُور اولین کا مشہور و معروف حکم ہے۔ ماہ ربیع الاول ۳۳۱ھ کو بغداد میں پیدا ہوا۔ مامون خوارزم شاہ کا ندیم تھا۔ فتح خوارزم کے بعد سلطان محمود کے ہمراہ غزنین میں آیا۔ منطق فلسفہ اور طب میں اُس نے پندرہ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ مگر اس وقت ناپید ہیں۔

ابن النخار کا سنہ وفات تحقیق نہیں ہوا۔ و سنفلد (Lestynfeld) نے تاریخ اطباء عرب میں لکھا ہے کہ اس نے ۳۳۱ھ میں وفات پائی ہے۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ کیوں کہ سلطان محمود نے ۳۳۱ھ میں خوارزم کو فتح کیا۔ اور اس کے بعد اُسے اپنے ہمراہ غزنین میں لایا۔ یقین ہے کہ ۳۳۱ھ کے بعد بھی ابن النخار عرصہ تک بقید حیات موجود تھا۔ علامہ ابن ندیم ابن النخار کا معاصر ہے۔ اور اپنے کتاب الفہرست میں دو جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ شہر زوری نے بہ نسبت دیگر تذکرہ نویسوں کے اس کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

”مگر اب ازد و کلمہ کہ وہ نام است یعنی نام غیر نقل کردہ بود بسیارے کتب از سر بانی بہ عربی بکشت پیش یحییٰ بن عدی خواندہ بود۔ از خصوصیات او آن کہ ہر گاہ فیزی اور اطلب میداشت پیادہ میرفت دیگفت این رفتن راہ کفارہ درہائے ملوک و سلاطین فراق میسازم و اگر سلطان میطلبید سوار میرفت در لباس بزرگان و علما مان ترک و اسہائے بد و وضاعت خود را بہ تواضع با فقر او بہ تعاطف با بزرگان بجائی آورد۔ جالینوس و جمیع حکما و نیز این طریق سلوک میداشتند۔“

و ابن ابوالخیر در بغداد تولد یافتہ بود۔ مامون پسر محمود خوارزم شاہ اور امیر خوارزم شاہ برد محمود بک تگس بر خوارزم شاہ مستولی گشت اور بغزنیہ آورد۔ روزے سلطان محمود بک تہ عارضہ اور طلب نمود و اسی از برائے سواری او فرستاد و سوار بہ بازار کفش فروشان عبور کرد و اسپا و کرم کرد اور ایندخت و بکشت۔ سلطان محمود اور اناسیہ عطا فرمود کہ آنرا ناجیہ بخار میخواستند و ادرا منسوب باین بقعہ دانستہ اند۔

اور اقصانیف بسیار است در اقسام علوم حکمت بعضے از ان مقالہ است در توفیق میان نصائی

وفا سے وصال ہے اور ظاہر ساغق آراء کے حکماء و درباری تعالے و شرائع و مقالہ است در رد
بازگشت و کتابی است در کیفیت خلق انسان و اور البقیہ طنائی میگفتند سزاوارد بود بہ این اسم۔

حکیم ابوریحان محمد بن احمد البیرونیؒ مشہور و معروف مؤرخ اور ہیئت دان ہے۔ او ۳۶۳ھ بمقام
خوارزم پیدا ہوا۔ اور ۴۴۰ سال کی عمر میں ۳ رجب ۴۴۰ھ کو غزنین میں فوت ہوا۔ بیرونی منسوب ہے بیرونی
خوارزم سے۔ ابوریحان چون کہ خاص شہر خوارزم کا باشندہ نہیں تھا بلکہ حوالی خوارزم کا رہنے والا تھا، اس لئے
بیرونی کے لقب سے مشہور ہوا۔ امام عبد الکبیر محمد بن اسماعیل المتوفی ۵۲۲ھ نے اپنی کتاب الاشارہ میں جو ابوریحان
کی وفات کے قریباً سو سال بعد تالیف ہوئی ہے۔ لکھا ہے۔ البیرونی بفتح الباء الموحدة و سکون الیاء آخر الحروف
و ضم الراء بعدھا الواو فی آخر ہا تون ہذہ النسبۃ الی خارج خوارزم فان ہما من یکون من خارج البلد و لایکون من
نفسہا یقالہ فلان بیرونی است و یقال بلغتم ان بشرک است و المشہور ہذہ النسبۃ ابوریحان المنجم البیرونی۔
ابوریحان کی عمر کا ابتدائی حصہ خوارزم میں آل مامون کے دربار میں گزرا ہے۔ اسی دوران میں کچھ عرصہ کے
لئے ابوریحان جرجان کو چلا گیا۔ اور وہاں شمس المعانی ابو قابوس بن وشمگیر کے دربار میں رہا۔ ۴۴۰ھ میں اس کے
نام سے آثار الباقیہ تصنیف کی۔ ۴۴۰ھ میں جرجان سے خوارزم میں واپس آیا۔ اور ۴۴۰ھ تک قریباً سات سال
ابوالعباس مامون بن مامون خوارزم شاہ کے دربار میں بسر کئے۔ سلطان محمود فتح خوارزم کے بعد ۴۴۰ھ کے موسم میں
غزنین کو واپس آیا تو اپنے ہمراہ ابوریحان کو بھی غزنین میں لایا۔ بھٹان ہوتا ہے کہ غزنین میں آنے کے بعد سلطان محمود
سلاطین میں شریک ہو کر ابوریحان کو بارہندوستان میں آیا۔ اور یہاں کے پندتوں سے میل جول پیدا کر کے سنسکرت
زبان سیکھی پھر ہندوستان کے علم تاریخ و جغرافیہ ہیئت اور ریاضیات اور دیگر علوم کو حاصل کیا اس کے بعد اپنی مشہور
کتاب الہند کھنی م شروع کی جو سلطان محمود کے زمانہ میں ختم تمام کو پہنچی ہے۔

۱۔ ایڈورڈ سیخاؤ (Seckhaue) نے آثار الباقیہ کے دیباچہ میں ابوریحان کے حالات لکھے ہیں اور اس کی ترتیب میں
ان تمام مضامین سے فائدہ اٹھایا ہے جو گزشتہ صدی سے اخیراً یام تک ابوریحان کے متعلق مشرق و مغرب میں لکھی گئی ہیں اور اس سے
بترتد کہ اب تک نہیں لکھا گیا ہے۔ مٹور بالاسی مضمون سے ماخوذ ہیں تاہم بغیر احتیاط کتب ذیل بھی ہم لے دیکھ لی ہیں۔
ابن ابی اصیبعہ جلد ۲ صفحہ ۲۰۱ البیہٹ ہٹری جلد ۲ صفحہ ۱۶۷ و کلن جلد ۱ صفحہ ۲۰۷۔ آثار الباقیہ ترجمہ انگریزی دیباچہ

یورپان نے مختلف علوم و فنون میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں قانون مسعودی سب سے بہترین تصنیف ہے۔ مسلمانوں نے علم ہیئت کے متعلق اس وقت تک جو کچھ لکھا ہے ان سب سے یہ کتاب مکمل اور بہتر تسلیم کی گئی ہے۔ آثار الباقیہ عن قرون الخالیہ میں اقوام قدیمہ کے علم کی تاریخ مذکور ہے۔ کتاب المندیں ہندوؤں کی تاریخ اور علوم و فنون کے حالات ہیں۔ کتاب التہفیم فی صناعت التیجہ نجوم و ہندسہ تحریر ہیں۔ یہ کتاب یورپان نے خوارزم کی ایک امیر زادی ریحانہ بنت الحسن کے نام پر تالیف کی ہے اور اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علمی قدر دانی میں اُس زمانہ کی عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش تھیں۔ بعض دیگر تصنیفات کے نام یہ ہیں کتاب الارشاد فی احکام النجوم۔ کتاب الجاہر فی الزواہر متعالید الہیئت۔ العجائب الطبعہ وغیرہ۔ علاوہ ان کے سنکرت کی بیس سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ کیا یا خلاصہ لکھا ہے۔

باب پنجم

دربار سلطان محمود کے شعرا

دربار سلطان محمود کے شعراء۔ غصری۔ عسجدی۔ عضاری۔ فرخی۔ آل محتاج۔ اسدی

منثوری۔ ہرامی۔ امیر قاسمی۔ بدایعی بلخی۔

حکیم ابوالقاسم حسن بن احمد الغصریؒ بلخ کا باشندہ تھا۔ ابوالمظفر امیر نصر بن بکتگین خراسان کا گورنر تھا غصری پہلے پہل اس کی خدمت میں آیا اور اس کے توسط سے سلطان محمود کے دربار میں باریاب ہوا سلطان نے اُس کی نہایت قدردانی کی اور ملک الشعراء کا خطاب دے کر دربار کے تمام شعرا کا افسر مقرر کیا۔ اس کے جاد و جلال اور دولت و ثروت کا یہ حال تھا کہ اس کا کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں پکتا تھا۔ اور جب مکان سے باہر نکلتا تھا تو چار سوز ریں کمر غلام اُس کے ہمراہ رکاب رہا کرتے تھے۔

۱۔ عونی جلد ۲ صفحہ ۲۰۔ دولت شاہ صفحہ ۴۴۔ مجمع الفصی جلد ۵ صفحہ ۳۵۵۔ خزائن عامرہ صفحہ ۳۷۔ آراء النیال صفحہ ۴۴۔

آتشکدہ صفحہ ۳۱۹۔ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۲۹۔ برون جلد ۲ صفحہ ۱۲۰۔

عام طور پر مشہور ہے کہ غصری کے اشعار میں ہزار سے زیادہ تھے۔ ۳۲۰ء میں طہران میں اس کا ایک دیوان چھپا
ہی جس میں قصائد کے علاوہ چند غزلیات اور رباعیات بھی ہیں اور اس کے اشعار کی مجموعی تعداد تین ہزار ہے
غصری نے غزلیات و قصائد کے علاوہ متعدد مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ اسدی طوسی نے اپنے لغات میں ان
مثنویوں کے بعض ابیات نقل کئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ بہر شاہنامہ کی بحر میں ہے

چو سرگشتہ غنچہ سرخ گل جہاں جامہ پوشید ہر نگاہ

دامق و عذرا بحر ہفت پیکر کی بحر میں ہے

گفت کیس مردان میباگ اند ہمہ ہوارہ دزد و چالاک اند

ایک مطلق قصیدہ میں غصری نے سلطان محمود کے فتوحات بیان کئے ہیں۔ دولت شاہ نے لکھا ہے
کہ اس قصیدہ کے اسی بیت ہیں۔ لیکن دیوان کے مطبوعہ نسخہ میں کل ساٹھ شعر چھپے ہیں۔

تمام تذکرہ نویسوں نے باتفاق لکھا ہے کہ مسعود کے زمانہ میں ۳۱۴ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ صاحب آتشکدہ
نے لکھا ہے کہ سلطان ابراہیم بن مسعود کے زمانہ میں غصری کا انتقال ہوا۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے کیوں کہ
غصری کی وفات کے ۲۰ سال بعد ۳۱۴ھ میں ابراہیم بن مسعود تخت نشین ہوا ہے۔

ابو نصر عبد العزیز بن منصور العسجدی بلخوفی نے لکھا ہے کہ مرد کا باشندہ تھا۔ دولت شاہ نے ہرات کو اس کا
وطن بتایا ہے۔ دربار سلطان محمود کے مشاہیر شعرا سے ہے۔ سلطان محمود جب سومات کی مہم سے واپس آیا
تو اس کی تنیت میں عسجدی نے ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے

تاخوردہ بین سفر سومات کرد کردار خویش را علم معجزات کرد

سلطان مسعود کے زمانہ میں ۳۱۴ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

ابوزید محمد بن علی الغضائریؒ المروزی۔ ری کا باشندہ ہے۔ ابتدا میں اسے بہاد الدولہ بویہ ۳۱۳ھ

لہ عونی جلد ۲ صفحہ ۵۰۔ دولت شاہ صفحہ ۴۴ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۳۹ مرآۃ الخیال صفحہ ۲۲۔ آتشکدہ صفحہ ۳۶ مجمع الفصحا جلد

صفحہ ۳۴۰۔ برون جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ لہ عونی جلد ۲ صفحہ ۵۹۔ دولت شاہ صفحہ ۳۳ خزائنہ عامرد صفحہ ۳۶۱

مجالس المؤمنین صفحہ ۵۰۔ مرآۃ الخیال صفحہ ۲۲ مجمع الفصحا جلد ۱ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۳۹۔ برون جلد ۲

۱۰۱۲ھ کے دربار سے تعلق تھا۔ اور وہاں سے ہر سال ایک قصیدہ لکھ کر سلطان محمود کی خدمت میں بھیجتا جس کے صلہ میں اسے ہزار دینار ملا کرتے تھے۔ بہاؤ الدولہ کی وفات کے بعد غزنین میں آیا۔ اور سلطان مسعود کے اوّل عہد میں ۱۰۱۲ھ فوت ہوا۔

غضاروی کا املا، فین معجمہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں کاشی ساز و کاہ گر۔ اور یہ منسوب ہی غضار سے غضا بر جمع قیاسی ہی غضارہ کی۔ غضارہ کے معنی ہیں گل چسپیدہ اور وہ ظروف سفالین جن پر کاشی اور چینی سے گل بوٹے بنائے جاتے ہیں غضارہ کہلاتے ہیں۔ صاحب مجمع الفصحا نے غضاروی کو بدن یا بعد الالف لکھا ہے ہی یعنی غضاروی یہ غلطی ہے۔ حکیم عنصری اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے ۵

کجا شریف بود چون غضاروی بر تو ز طبع باشد چونانکہ از سرخ و سفال

برگ نے تاریخ فرشتہ کے ترجمہ میں اس کا تلفظ عین مہملہ سے ادا کیا ہے (Uzaeeni Razi) جن انگریزی مصنفین نے اُس کے حالات برگ کے ترجمہ سے نقل کئے ہیں ان میں بھی یہ غلطی موجود ہے۔

ابو الحسن علی بن جلولوغ الفرخی نے سجستان کا باشندہ ہے۔ اس کا باپ جلولوغ امیر احمد خلف حاکم سجستان کا غلام تھا۔ فرخی ایک دہقان کے یہاں ملازم تھا۔ اور اُس خدمت کے معاوضہ میں اسے سالانہ دو سو کیل غلہ اور سو درہم ملا کرتے تھے۔ اُس نے امیر خلف کی ایک کینز سے نکاح کر لیا۔ جس کی وجہ سے موجودہ معاش غیر کافی ثابت ہوئی۔ اور اُس نے دہقان سے تین سو کیل غلہ اور ڈیڑھ سو درہم مانگے۔ لیکن دہقان نے صاف جواب دیدیا کہ اس قدر دینا قدرت کا باہر ہے۔ فرخی مایوس ہو کر سجستان سے نکلا۔ اور قسمت آزمائی کرتا ہوا ابوالمظفر چغانی کے دربار میں آیا۔ اور کچھ عرصہ چغانیاں میں بسر کرنے کے بعد سلطان محمود کے دربار میں باریاب ہوا رفتہ رفتہ ایسے مراتب عالیہ حاصل کر لے کہ جب باہر نکلتا تو میں زریں کمر غلام سواری کی جلو میں چلا کرتی تھے۔ فرخی نے صنائع بدائع فارسی میں ایک کتاب ترجمان البلاغۃ لکھی ہے جو اس وقت ناپید ہے۔ لیکن رشید الدین و طوٹ نے اسے دیکھا تھا۔ اور اپنی کتاب حیات السحر میں اُس کے متعلق لکھتا ہے۔

۵ فرشتہ کا انگریزی ترجمہ جلد ۸۹ صفحہ ۸۹۔ زندانۃ کی کتاب ۱۷ چار مقالہ صفحہ ۲۷ تا صفحہ ۵۲ عونی جلد ۲ صفحہ ۴۷ دولت شاہ

صفحہ ۵ فرشتہ جلد ۳۹ آتشکدہ صفحہ ۸۶ خزائن عامرہ صفحہ ۳۶ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۲۳۹ برون جلد ۲ صفحہ ۱۲۲۔

”کتابت و معرفت بدائع شعر فارسی کہ آنرا ترجمان البلاغت خوانند بہن بندہ نمود بنگیرتیم شواہد این
کتاب را ناخوشخندیم ہمہ از راہ کلفت نظم کردن و بطریق تعسف فراہم آوردہ و با این ہمسہ از انواع
زل و غل غالی نہ بود“

۳۲۹ء میں بزمان سلطان مسعود غزنوی نے وفات پائی یہی حقیقت یہ ہے کہ ابوالمظفر چغانی کے بارے میں
اکثر مؤرخین اور تذکرہ نویسوں سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ دولت شاہ نے اس کا نام اس طرح لکھا ہے۔ ابوالمظفر
نصر بن ناصر الدین حاکم بلخ۔ ”مؤرخ فرشتہ اسے سلطان محمود کا برادر زادہ لکھتا ہے۔ میر غلام علی آذانی نے اس کا نام
ناصر الدین چغانی بتایا ہے۔ دالہ دغستانی اور لطف علی آذر سے بھی اسی طرح کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں حقیقت
یہ ہے کہ ابوالمظفر کا نہ تو خاندان سبکتگین سے کوئی تعلق ہے اور نہ وہ بلخ کا والی رہا ہے۔ بلکہ اس کا سلسلہ نسب
آل محتاج سے ملتا ہے۔ آل محتاج ماوراء النہر کے امیران کبار کا ایک خاندان ہے۔ ملوک سامانیہ اور غزنویہ کے
زمانہ میں ان کو خوب عروج حاصل ہو گیا تھا۔ اور چغانیاں کی حکومت ان کے خاندان میں بطور میراث چلی
آتی تھی۔ ادب و تاریخ کے صفحات ان کے حالات گہرے ہیں۔

ابو بکر محمد بن مظفر بن محتاج اس خاندان کا جدِ علی ہے ۳۱۳ء میں امیر نصر بن احمد سامانی نے اسے جمیع عساکر خراسان کا
صاحب الجیش بنایا تھا۔ ۳۲۹ء میں جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کا لڑکا ابوعلی احمد بن محمد کو امیر نصر بن نصر نے
اُس کے باپ کی خدمت پر بحال کر دیا۔ مشہور ادیب ابو القاسم اس کا کاتب تھا۔ ۳۳۳ء میں کسی وجہ سے فوج
بن نصر سامانی نے اسے معزول کر دیا تو اُس نے امیر کے خلاف بغاوت برپا کر دی اور ایک عرصہ تک اپنی
موروثی حکومت کے لئے لڑائی جھگڑے کرتا رہا یہاں تک کہ ۳۳۸ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا لڑکا ابو منصور
بن احمد بن محمد ابتدا میں اس کا نائب تھا۔ لیکن ابوعلی کی وفات پر امیر فوج نے اسے باپ کی حکومت عطا کر دی۔
اس کی وفات پر ابوالمظفر طاہر بن افضل بن محمد بن المظفر جو ابوالمصور کا چچا تھا برسرِ حکومت ہوا۔ طاہر بن فضل
بڑا ذی علم اور ہنر پرور امیر تھا۔ شعر خوب کہتا تھا۔ بڑے بڑے شاعر دقیق اور منجیک ترندی وغیرہ اس
کے دربار سے وابستہ تھے ۳۴۵ء میں جب اُس کا انتقال ہوا تو ابوعلی کے لڑکے فخر الدولہ ابوالمظفر احمد بن

علی بن محمد کو چٹانیاں کی حکومت ملی۔ اسی کے زمانہ میں فرخی چٹانیاں میں آیا تھا۔ اس واقعہ کو نبطی می عروضی سمرقندی نے چار مقالہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

فرخی کو جب یہ معلوم ہوا کہ امیر ابو المنظر بڑا فیاض اور شعر کا قدردان ہے تو سیستان سے نکل کر چٹانیاں میں آیا۔ امیر نے افزائش نسل کے لئے اٹھارہ ہزار گھوڑیاں رکھی تھیں اور موسم بہار میں داغ گاہ میں جا کر ان کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ امیر اس وقت داغ گاہ میں مقیم تھا۔ فرخی وہیں پہنچا عمید اسعد سے دربار میں پہنچا کی خواہش کی عمید نے جب اُس کی شکل و صورت اور ظاہری حالت کو دیکھا تو اس کے شاعر ہونے کا اُسے مطلق یقین نہ آیا۔ اور امتحان کے لئے اُس سے ایک قصیدہ داغ گاہ کی تعریف میں لکھوایا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

چوں پرند نیلگوں بر روی پوشد مرغ زار پر نیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہ سار
عمید نے جب قصیدہ سنا تو حیران ہو گیا اور دوسرے روز اُسے امیر کی خدمت میں پیش کیا۔ فرخی متوثری دیر کے بعد آواز حزیں اپنا ایک دوسرا قصیدہ امیر کو سنایا جس کا مطلع یہ ہے۔

بکارواں حلد بر فتم و سیستان با حلا قیدہ ز دل یافتہ زجاں
امیر سخن شناس تھا۔ قصیدہ کو بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد فرخی نے وہ قصیدہ پڑھا جس میں داغ گاہ کی تعریف تھی۔ امیر کو سخت حیرت ہوئی۔ اور اسی عالم میں فرخی سے کہا کہ داغ گاہ میں ہزار بچیرے ہیں ان میں جس قدر تم پکڑ لو وہ سب تمہارے ہیں۔ فرخی اُٹھا۔ ایک عرصہ تک سرگرداں پھرتا رہا۔ لیکن اُسے ایک بچیرے کے پکڑنے میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ دوسرے دن امیر نے فرخی کو بلوایا۔ ایک خاصہ کا گھوڑا تین اونٹ پانچ غلام اور پہننے کے کپڑے انعام عطا کئے اور بچیروں کا وہ گلہ بھی اُسے دیدیا جن کے پکڑنے کے لئے فرخی ایک عرصہ سرگرداں رہا تھا۔

حکیم ابو نصر احمد بن منصور الاسدیؒ۔ اسدی تخلص کے دو شخص گذرے ہیں۔ احمد بن منصور الاسدیؒ

علی بن احمد لاسدی - ان میں پہلا باپ دوسرا بیٹا ہی۔ ان کے حالات لکھنے میں فارسی تذکرہ نویسوں سے غار غلطی ہوئی ہے۔ بلا امتیاز دونوں کو شخص واحد سمجھا ہے۔ اور ان کے حالات باہم غلط ملط کر دیئے ہیں۔

احمد بن منصور لاسدی - اس کا سلسلہ قدیم شاہان ایران سے ملتا ہے۔ طوس کا باشندہ اور فردوسی کا استقامت تھا۔ نیز فردوسی کی بہن بھی اس سے منسوب تھی۔ مدت تک سلطان محمود کے دربار میں رہا۔ اور سلطان مسعود کے عہد میں ۳۳۳ھ سے پہلے اس کا انتقال ہوا ہے۔ اُس نے اپنے قصائد کے ابتدائیں بطور مہتمد مناظرات لکھے ہیں۔ ان کے بعد مہج کی جانب گزیر کرتا ہے۔ ان مناظرات کی علمی دنیا میں نہایت شہرت ہے۔ مہجدان کے پانچ مناظروں کے متعلق جن کے عنوان یہ ہیں۔ ارض و سما۔ یل و نمار۔ قوس و رمح۔ عرب و عجم۔ گبر و مسلمان۔ ڈاکٹر ہرن ایسٹی (Ethe) نے ایک عالمانہ مضمون لکھ کر نیشنل اور نیٹل کانفرنس کی پانچویں اجلاس میں پیش کیا ہے جو ۱۸۵۸ء میں بمقام برلن منعقد ہوا تھا اور اس کی روئیداد کے صفحہ ۴۸ میں چھپا ہے۔

علی بن احمد لاسدی کو ابتدائیں ملوک بویہ کے دربار سے تعلق تھا۔ پھر آذربائجان چلا آیا۔ اور ابو دلف کرکری رئیس اران کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ اُس کے وزیر کی فرمائش سے شاہنامہ کو جواب میں گرشاسپ لکھا ہے۔ چنانچہ دیباچہ میں کہتا ہے (صفحہ ۸)

بن گفت فردوسی پاک مغز	بدا داست داد سخنائے نغز
بہ شہنامہ گیتی بیاراستہ است	وزان نام نام نگو خواستہ است
تو ہم شہری اور او ہم پیشہ	چو او در سخن جا بک اندیشہ
از ان ہر ہاں نامہ یاستاں	بہ نظم آرخرم یکے داستاں

گرشاسپ نامہ ۳۵۱ھ میں اختتام کو پہنچا ہے۔ اور اس کا ایک نسخہ خود لاسدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا دینا کی امپریل لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب نہایت کیا ب اور غیر معروف ہے۔ بعضوں نے اس کو فردوسی کی تصنیف سمجھ کر شاہنامہ میں ملحق کر دیا۔ ٹرنز میکن نے بمقام کلکتہ جو شاہنامہ چھپوایا ہے۔ اُس کی جلد چارم میں یہ الحاقی حصہ بطور ضمیمہ موجود ہے۔

لغت فرس علی اسدی فارسی لغت کا سب سے پہلا مدون ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں ناد را در غریب الفاظ جمع

لے اس کے متعلق اس رسالہ کا پہلا مضمون ملاحظہ ہو۔ (اڈیٹر)

کے ہیں۔ اور بالالتزام ہر لفظ کے ساتھ اساتذہ کے اشعار کو بطور شواہد نقل کیا ہے۔ یہ کتاب سترہ سو میں مقام کوٹنگن چھپی ہے۔

اکثر تذکروں میں لکھا ہے کہ فردوسی جب غزنین سے نکلا تو شاہنامہ ناتمام تھا۔ اور جب اُس کا وقت رحلت قریب آیا تو اُس نے اسدی کو بلا کر شاہنامہ کو مکمل کرنے کی خواہش کی۔ پس زیدی نے چار ہزار بیت میں تسلط عرب بر عجم کے حالات کو بیان کر کے کتاب کو ختم کر دیا۔ حقیقت میں یہ ایک فرضی کہانی ہے۔ کیوں کہ فردوسی تصنیف شاہنامہ کے بعد مدت تک زندہ رہا ہے۔ اس کے بعد عراق میں جا کر مثنوی یوسف زلیخا لکھی ہے۔ یہی حالت میں یہ امر بعید از قیاس ہے کہ شاہنامہ کو فردوسی ناتمام رکھتا۔ اور اسدی سے اس کو مکمل کراتا۔ ابو سعید احمد بن محمد المنشوریؒ سمرقند کا باشندہ ہے۔ سلطان محمود کے درباری شعراء میں شامل تھا۔ رشید الدین دطواط نے حقایق السحر میں لکھا ہے کہ اس نے صنعت تلون کو مختصر کیا ہے۔ اور رشیدی نے اس کی شرح لکھی ہے جس کا نام کنز الغرائب ہے۔ صنائع لفظیہ میں تلون اس صنعت کو کہتے ہیں کہ ایک شعر دہر یا زیادہ میں پڑھا جائے۔

ہستاد ابو الحسن علی البہرامیؒ سرخس کا باشندہ ہے۔ فن عروض و قافیہ میں سرآمد روزگار ہوا ہے۔ عونی نے اُس کے حالات میں لکھا ہے کہ

”اور اور علم شعر و معرفت آں ہمارے کامل بود خجستہ نامہ کہ در علم عروض بے نظیر است
از مشابہت اوست بہرامی نے شعر فارسی کے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں مثلاً غایت الغرین
کنز القافیہ خجستہ نامہ وغیرہ یہ کتابیں اس وقت ناپید ہیں۔ شمس الدین قیس نے انھیں دیکھا
تھا۔ اور اپنی کتاب المعجم فی معایر اشعار العجم کی تالیف میں اُن سے استفادہ کیا ہے۔“

بہرامی نے پنشنہ میں وفات پائی ہے۔ عونی نے اس کو محمودی شعراء میں شمار کیا ہے۔ صاحب مجمع لفظیا کا بیان ہے کہ ناصر الدین سبکتگین کا معاصر تھا۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ کیوں کہ سبکتگین نے ۶۹۹ھ میں وفات

لے تذکرہ دولت شاہ ۳۵۵ھ چار مقالہ صفحہ ۳۵۵ عونی جلد ۲ صفحہ ۲۲۲ حقایق السحر ورق ۱۱ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۵۰۶

۳۵۵ھ چار مقالہ صفحہ ۳۵۵ عونی جلد ۲ صفحہ ۵۰۶ لغات اسدی صفحہ ۲۱ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۱۷۳

پائی ہے۔ اور بہرامی اُس کی وفات کے قریباً ایک سو تیرہ سال بعد پنشنیہ میں فوت ہوا ہے۔
 امیر بزرچہمربو المنصور قسیم بن ابراہیم بن منصور قافینی سلطان محمود اور مسعود کے زمانہ میں گذرا
 ہے۔ ذی ثروت اور دولت مند امیر تھا۔ عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا۔ فارسی کلام
 عونی نے نقل کیا ہے۔ عربی قصاید جو سلطان محمود کی مع میں ہیں اُن کے بعض انتخاب امام ثعلبی کی کتاب
 تہذیب الیتمہ میں مذکور ہیں۔

محمد بن محمود البدر النحوی بلخ کا باشندہ ہے۔ سلطان محمود کی فرمائش سے اُس نے وزن تقاربیر
 نصیحت نامہ نو شیرداں کو منظوم کیا ہے۔ یہ کتاب اس وقت لکھا گیا ہے۔ صاحب مجمع الفصحا نے اس کے
 متفرق اشعار نقل کئے ہیں۔

۱۔ چار مقالہ صفحہ ۳۵ - عونی جلد ۳ صفحہ ۳۳ مجمع الفصحا جلد ۶ صفحہ ۶۶ ۲۔ مجمع الفصحا جلد ۴ صفحہ ۱۷

خطباتِ گاریانِ قاسی

(مترجم جناب سید راہ سود صاحب بنی اسے (اکن) آئی امی اس۔ ناظم تعلیمات حیدرآباد (دکن))

(تیسرا خطبہ - بتاریخ ۵ دسمبر ۱۸۵۲ء)

حضرات !

لفظ ”ہندوستانی“ اس زبان کے حق میں جس کے لئے یہ استعمال کیا جاتا ہے ناموزوں ہے اور اُسے اس نام سے یاد کرنا ہماری بدذاتی ہے۔ البتہ اس کو ہندوستانی (Hindustani) کہا جاسکتا ہے۔ مگر انگریزوں کی تقلید میں ہم نے بھی اس کی ابتدائی شکل قائم رکھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ ہندوستانی اہل ہندوستان کی زبان ہے مگر یہ زبان اپنی حقیقی حدود سے باہر بھی بولی جاتی ہے خصوصاً مسلمان اور سپاہی اس کو تمام جزیرہ نما ہندوستان نیز ایران تبت اور آسام میں بھی بولتے ہیں۔ پس اس زبان کے لئے لفظ ”ہندی“ یا ”انڈین“ جو ابتدائیں اس کو دیا گیا تھا اور جس نام سے کہ اکثر باشندے اس ملک کے اب تک اس کو موسوم کرتے ہیں اس نام سے زیادہ موزوں ہے جو اہل یورپ نے اختیار کیا ہے۔ اہل یورپ لفظ ہندی سے ہندوؤں کی بولی مراد لیتے ہیں جس کے لئے ”ہندوی“ بہتر ہے اور مسلمانوں کی بولی کے واسطے ”ہندوستانی“ کا نام قرار دے لیا ہے۔ خیر یہ جو کچھ بھی ہوا، ہندوستانی اس جدید زبان کی دو بڑی اور خاص شاخیں برٹش انڈیا کے بڑے حصے میں بولی جاتی ہیں اور شمال کے مسلمانوں کی زبان یعنی ہندوستانی اردو ممالک مغربی و شمالی کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے۔ اگرچہ ہندی بھی اردو کے ساتھ ساتھ

۱۵ سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ ماہ جنوری ۱۳۵۲ھ

اسی طرح قائم ہے جیسے کہ وہ فارسی کے ساتھ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان بادشاہ ہمیشہ ایک ہندی سکرٹری جو ہندی نویس کہلاتا تھا اور ایک فارسی سکرٹری جس کو وہ فارسی نویس کہتے تھے رکھا کرتے تھے تاکہ ان کے احکام ان دونوں زبانوں میں لکھے جائیں اسی طرح برٹش گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی میں ہندو آبادی کے مفاد کے لئے اکثر اوقات سرکاری قوانین کا اردو کتابوں کے ساتھ ہندی ترجمہ بھی دیو ناگری حروف میں دیتی ہے۔

حضرات! میں نے اس سے قبل آپ کے سامنے کئی مرتبہ ہندوستانی علم ادب اور اس کی مختلف شاخوں کی نسبت تقریر کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس زبان کی تاریخ کی پہلی جلد میں نے ۵۰ مصنفوں اور آٹھ سو سے زیادہ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تیسری جلد میں جس کے طبع ہونے میں بعض وجوہ سے تاخیر ہو گئی ہے، میں اس سے دو چند جدید مصنفوں کا اور اسی قدر کتابوں کا احوال لکھوں گا۔ ویسی سوانح نویس عموماً صرف ان لوگوں کے چند اشعار لکھ دینے پر اکتفا کرتے ہیں جن کی سوانح عمری وہ لکھ رہے ہیں اور ان کی خاص خاص تصانیف اور تابغات کا ذکر نہیں کرتے۔

اس وقت میں ان مشہور مصنفین میں سے صرف تین کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جن کے متعلق میں نے اطلاع ہم پہنچی ہے۔ یہ تینوں صاحب دہلی کالج کے پروفیسر ہیں۔ جہاں کا صدر یعنی پرنسپل بارہ سال سے ایک مشہور فرانسیسی فیلکس بوترو (*M. Felix Boudro*) ہے۔ صدر مذکور ”ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی“ (یعنی انجمن ترجمہ) کے بانیوں میں سے ہیں۔ اور اسی انجمن نے سنسکرت فارسی عربی اور انگریزی زبانوں سے ترجمے کر کے ہندوستانی زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔

مذکورہ بالا اصحاب میں سے پہلے شخص رام چند ہیں جن کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر (اور کہا جاتا ہے کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو ہیں جنہوں نے یہ مذہب اختیار کیا) اس سال کے ماہ جولائی میں خاصی لمبل پمچ گئی تھی۔ اس پنڈت کی عمر اس وقت ۳۵ سال کی ہے۔ شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا۔ اور اس کالج میں اس نے انگریزی ہندوستانی اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا۔ لیکن علم ریاضی کی طرف اس کا خاص رجحان تھا۔ وہ متعدد مفید کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے جن میں سے ایک انگریزی *Bridge and Scales* کی

تقلید میں لکھا گیا ہے۔ ایک کتاب علم مثلث پر ہے جس میں مخروطات بھی شامل ہیں - *Analytical Trigonometry with conic sections* - اور ایک کتاب علم ہندسہ پر ہے جو *Bourcholat* کے طریقہ پر مرتب کی گئی ہے۔ ایک کتاب علم الحساب پر لکھی ہے اور ان کے علاوہ کئی کتابیں ادب پر ہیں۔ یہ پروفیسر دور سالوں کے اڈیٹر بھی ہیں ان میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کا نام ”محبوب ہند“ ہے یہ ایک مامانہ پرچہ ہے جس میں اہم مسائل و معاملات وقت پر دیسیوں کی تعلیمی حالت پر اور مشترکہ ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔

دوسرے صاحب جن کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں رام کرشن ہیں یہ زبردست صوفی عالم اور انگریزی ادب میں ایسے ہی قابل ہیں جیسے رام چند۔ یہ کشمیری النسل اور دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ان کی عمر قریب چالیس سال ہے۔ انھوں نے بہت سے مضامین انگریزی سے اردو میں ترجمہ کئے ہیں جن کی عبارت نہایت فصیح اور شستہ ہے۔ چند ان میں سے یہ ہیں۔ دی پرنسپل آف ہندو لا (اصول ہندو شاستر) نصفہ سرولیم میکائن کا ترجمہ۔ یہی وہ صاحب ہیں جو عربی (الف لیلہ) کے اڈیٹر ہیں اور افغانوں اور انگریزوں کی گزشتہ لڑائی میں بمقام کابل مقول ہوئے۔ ترجمہ اصول حکومت (دی پرنسپل آف گورنمنٹ) کے علاوہ بھی قانون پر ان کی کئی تالیفات ہیں۔ نیز دوسرے فنون میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں مثلاً فن زراعت پر طب پر اور ایک انگریزی گرامر ہندوستانی زبان میں جس کے لکھنے میں انھیں ڈاکٹر اسپرنگر (*Springer*) نے بھی مدد دی ہے ڈاکٹر اسپرنگر اُس وقت دہلی کالج کے پرنسپل تھے۔ کالج فورٹ ولیم کالج میں محقق اور ایشیائیک سوسائٹی آف بنگال کے سکریٹری ہیں۔ ان میں سے تیسرے صاحب کریم الدین ہیں۔ یہ پانی پت کے رہنے والے اور جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے مسلمان ہیں تقریباً ساڑھے میں دہلی کالج میں شریک ہوئے اس وقت ان کی عمر وہ سال کی ہے ان کی تمام تالیفات نشر میں ہیں ان کو اس بات پر فخر ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی نظم نہیں لکھی۔ انھوں نے بہت بُرا جھلکا ہے کہ لوگوں نے ہندوستان میں شاعری کو پیشہ بنا لیا ہے۔ ان کی کتابوں میں بعض جدید تصانیف ہیں بعض ترجمے اور بعض تالیفات۔ پہلی صنف میں حسب ذیل کتابیں ہیں: ایک کتاب عورتوں کی تعلیم پر جس کے متعلق ہندوستان میں بہت غفلت کی جاتی ہے۔ ایک سوانح عمری ایشیا اور افریقہ کی مشہور

عورتوں کی۔ اور ایک کتاب عروض پر جو بہت مشہور ہوئی۔ دوسری صنف میں یہ کتابیں ہیں ابوالفدا کی تاریخ کا ترجمہ۔ ہندوستانی شاعروں کا تذکرہ اور عرب کے شاعروں کی تاریخ۔ تیسری صنف میں یہ کتابیں، ہندوستانی (اردو) کے اساتذہ کے کلام کا انتخاب۔ ایک کتاب وراثت پر جو اسلامی شریعت میں نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ علوم علی (exact sciences) پر ایک مختصر رسالہ اور دلچسپ مقولوں اور لطیفوں کی ایک کتاب جس کا نام ”باغ ہند“ ہے۔

سندھ کی طرح سندھ میں بھی ہندوستانی مطابع ممالک مغربی و شمالی میں برابر کام کرتے رہے۔ اس زمانہ میں ہندی اور اردو رسالے اور بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس سال پھر میرے پاس بعض دوستوں کی عنایت سے نئے مطبوعات کی فہرست پہنچ گئی ہے۔

حضرات! میں آپ کے سامنے ابتدائی رسالوں یا جو قدیم اساتذہ کی تصانیف یا مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا جو دوبارہ یا بار بار چھپتی رہتی ہیں، مذکر نہ کر دوں گا۔ اگرچہ اسلامی مذہبی کتب میں سے قرآن شریف معہ اردو ترجمہ کے ایک دہلی کا اور دوسرا اگرہ کا قابل لحاظ ہے۔ لیکن مذکورہ ذیل کتابیں خاص طور پر قابل بیان ہیں۔ ”تاریخ انگرہ“ جو محمد سدید الدین نے اردو میں لکھی ہے۔ ”بہار عشق“ مولفہ نور علی یہ کتاب نبل کا قصہ معلوم ہوتی ہے۔ ”قصہ گرد چیلہ“ یہ قصہ کھلیہ دمنہ کے قصہ کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ ”قصہ سپاہی زادہ“ دیوان نوید“ ایک مشہور معاصر شاعر کا دیوان۔ ”دیوان نظیر“ جو اب تک کامل نہیں چھپا تھا۔ گلستاں کا ہندوستانی ترجمہ جو پہلی مرتبہ فارسی متن کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ ایک تاریخی نظم فاتحانہ ہندوستان پر معہ انگریزی ترجمہ کے یہ کتاب شہنشاہِ دہلی کے حکم سے شاہی شاعر ہمارا جہ اپرواکرشن بہادر نے لکھی تھی۔ یہ شاعر اگرچہ ہندو تھا۔ مگر بجائے ہندی میں لکھنے کے جو عام طور پر ہندیوں کی زبان ہے۔ اس نے اردو میں لکھی۔ آخر میں ایک قصہ قابل بیان ہے۔ جو علم الاقوام کے نقطہ نظر سے موجب دلچسپی ہے اور ٹھیک ہندوستانی میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کے بغیر لکھا گیا ہے۔ اس کے لکھنے والے انشلا اللہ خاں تھے جو اسی صدی کے ابتدا میں ایک مشہور شاعر گذرے ہیں یہ قصہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ایک رسالہ میں طبع ہوا ہے۔

ہندی کی صرف ان کتابوں کے بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔ اخلاقی مقولے موسوم بہ ”نتی بنود“ ہندو سماجوں کے لئے ایک کتاب جس کا نام ”مہاتنی سروپکا“ ہے ہندی مطبوعات میں جن کی اشاعت کی اس سال اطلاع دی گئی ہے، وید کے کامل ترجمے خاص طور پر قابل بیان ہیں جس کے ساتھ اصل سنسکرت بھی چھپ گئی ہے۔ حضرات! مجھے اُمید ہے کہ میرے لکچر ہندوستان کی جدید زبان کے علمی اور ادبی مطبوعات کے پڑھنے میں کافی طور پر رہنمائی کریں گے۔ میری تعلیم کا طریقہ جو میں نے اختیار کیا ہے، وہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے تفصیلی ہے۔ میں ہر لفظ کی تشریح کرتا ہوں اور متن کے معنی و مطالب کے ساتھ ساتھ نحوی قواعد پر بھی نظر ڈالتا جاتا ہوں اور ہر محاورے کا تجزیہ کرتا ہوں۔ میری دانست میں ہی ایک طریقہ اعلیٰ اور صحیح ترقی کرنے کا ہے۔ ہم اس سال شیر شاہ کی تاریخ کے اُس حصہ کو ختم کریں گے جو گذشتہ سال ختم کیا گیا تھا۔ شیر شاہ افغانوں کا کینخسرو (Alexander) تھا جو اگرچہ ابتدا میں ایک گورنر تھا مگر اپنی قابلیت، اپنے کیرکٹر اور اپنے انصاف و عدل کی وجہ سے تختِ دہلی پر قابض ہو گیا۔ ابھی وہ بہت کم عمر تھا کہ اُس کے والد نے اُسے اپنے علاقہ کے ایک حصہ کا انتظام سپرد کیا۔ والد سے رخصت ہوتے وقت اُس نے یہ الفاظ کہے ”ابا جان! مجھے اجازت دیجئے کہ میں جناب سے اپنے دلی خیالات کا صاف صاف اظہار کروں۔ میری خواہش ہے کہ میں اس ملک کی زراعت کی ترقی میں کوشش کروں جس کو آپ نے میرے سپرد کیا ہے اور اس کی اصلاح و وہبودی میں کوشاں رہوں۔ مگر میں اپنے مقصد میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں ہر معاملہ میں عدل و انصاف سے کام نہ لوں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ عدل اعلیٰ ترین نیکی ہے اس سے سلطنتوں کی دست اور استحکام ہو۔ اور اسی خزانہ مالِ اوٹھرا در قصبے آباد و خوش حال ہوتے ہیں۔ ظلم اس کے برعکس ہو اور بدترین عیوب میں سے ہے یہ تباہی و بربادی کا موجب ہوتا ہے اور جو اس کا قریب ہوتا ہے وہ دنیا و عاقبت میں ذلیل و سدا ہوتا ہے۔ پس ہر بادشاہ کا فرض ہو کہ اپنی رعایا سے ہر بانی سے پیش آئے اور اُن کی خبر گیری کرے کیونکہ خدا نے رعایا کو بادشاہوں کی پناہ میں دیا ہے جن کا فرض ہے کہ اُن کو ظلم و استبداد سے بچائیں اور اُن کو خوش رکھیں۔ اس کے حصول کے لئے کامل عدل اعلیٰ انتظام ضروری ہے۔ عمدہ حکومت کے نہ ہونے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور رعایا کے حقوق تلف ہوتے ہیں۔ اچھی حکومت کی مثال اُس بارش کی سی ہے

جو زندگی بخشی ہے اور بغاوت کے گرد و غبار کو دبا دیتی ہے اور وہ اس تلوار کی مانند ہے جس کے جوہر کا عکس سلطنت کے رخسار پر پڑتا ہے اور اس کو مثل آفتاب کے منور کر دیتا ہے۔

میں اس امر سے ناواقف نہیں ہوں کہ بعض عمدہ دار جو میرے ماتحت کام کے لئے تجویز کئے گئے ہیں ظلم اور سختی کو جائز رکھتے ہیں۔ میں سب سے اوّل اُن کو نرمی سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ میرے کہنے پر عمل کریں گے تو مجھے سختی نہیں کرنی پڑے گی لیکن اگر کچھ ایسے ہوں گے جن میں یہ خرابی اس درجہ سیرت کئے ہوئے ہے کہ وہ اُن سے نہیں چھوٹ سکتی تو میں سختی میں کوتاہی نہ کروں گا اور اُن کو ایسی سزا دوں گا جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہوگی۔ جب بد نظمی پھیلانے والے برطینت لوگ سلطنت کی آگ کو شعلہ زن دیکھتے ہیں تو چپے رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے جب انھیں ذرا سی بھی بد نظمی انتظام مملکت میں نظر آتی ہے تو ہر گنہہ فساد پیدا کرتے ہیں اور حکومت کی عمارت بہت جلد ٹکستہ ہو جاتی ہے۔ حکیموں نے کہا ہے کہ مملکت مانند ایک درخت کے ہے جس کی جڑوں کی آبیاری ہمیشہ اچھے نظم و نسق سے کرنی چاہئے تاکہ وہ امن و امان اور اطمینان کے ثمر سے بار آور ہو۔.....“

حضرات! میں اس سال پریم ساگر کی بھی تشریح کروں گا۔ پریم ساگر ایک کہانی ہے جو مستیع اور مقفی عبارت میں لکھی گئی ہے اور جگہ جگہ اس میں نظم بھی آتی ہے۔ یہ کہانی کرشن جی کے حالات سے متعلق ہے اور بھاگوت کے دسویں باب سے ماخوذ ہے۔ اسی ”پران“ کے ترجمہ کے طبع کا کام ایک مشہور ہندی کے عالم نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ وہ اسی دسویں باب تک پہنچا تھا کہ موت نے علم و ادب کے اس سرمایہ نازک کو ہم سے چھین لیا۔ لیکن ایک اور کتاب جو ہندی نظم میں ہے اور اسی دسویں باب کے قبیع میں لکھی گئی ہے اور پریم ساگر سے بھی قدیم ہے۔ فرانسیسی زبان سے حال میں (M. H. Parvie) موسیو تھامس بے دی نے طبع کرائی ہے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ موسیو موصوف میرے شاگردوں میں ہیں۔ اس کا نام ”کرشن جی اور اُن کی تعلیم“ ہے۔ اسے یوہین بورنوف کی کتاب کا تمہہ سمجھنا چاہئے۔

پریم ساگر ایک نہایت دلچسپ افسانہ ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ کی مقدس تاریخ سے لیا گیا ہے۔ اس کے ہر صفحہ میں عیسائی مذہب کے واقعات کا ہمہ سادہ نظر آتا ہے لیکن اتنا فرق ہے کہ وہ سچ ہے اور غلط۔

اور اسی لئے یہ کتاب مشابہت اور تضاد سے بھری ہوئی ہے۔ کرشن جی کی تیاری اگرچہ مشرقی تخیل کے عجائبات سے پُر ہے اور غیر مسیحی اخلاقی خرابیوں نے اُسے خراب کر دیا ہے۔ تاہم عیسائی مسیح کی تیاری سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے میں نے اپنی ایک تصنیف میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور اگرچہ میرا یہ خیال عیسائی ہونے کی بنا پر تھا مگر میں نے دیکھا کہ یہ مقابلہ مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچانے کے بجائے کتاب کی وقعت کو اور بڑھا دے گا۔ مجھے یہ بات بہت دلچسپ معلوم ہوئی کہ کرشن جی کی زندگی کے حالات عیسائی مسیح کے حالات کی مدلولے بازگشت ہیں اور اس کی تعلیم عیسائی مذہب کے اصول کا ایک عکس ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عیسائی مذہب ہندوستان میں بہت پہلے پھیل چکا تھا جیسا کہ ہماری مذہبی روایتوں سے بھی ظاہر ہے۔ سینٹ فرانسس زیویر جو پیرس یونیورسٹی کا مشہور طالب علم تھا اور "انڈیز کے بشر" کے لقب سے مشہور ہے، جب کوچین اور ٹرانکوور کے ساحلی قصبوں میں مذہب عیسائیت کی تبلیغ کے لئے پہنچا تو اُس نے وہاں کے اصلی باشندوں کو عیسائی مذہب کا پیرو پایا۔ جن کو اس زمانہ کے وقائع نویسوں نے "بردا" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اُسی نے مقام میلاپور میں سینٹ تھامس کی قبر بھی دیکھی۔ یہاں میں اس بات کا اشارہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ صوبہ بیجاپور میں جس کے بڑے شہروں میں گواہی ہے سینٹ نذکوہندوستان کی دکنی بولی میں غلط کرنا پڑا ہوگا۔ یہ بولی بیجاپور میں اسی طرح مروج ہے جس طرح مرہٹی۔

(چوتھا خطبہ - بتاریخ ۲۹ نومبر ۱۸۵۳ء)

حضرات! ہندوستانی زبان، جیسا کہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے، صرف بول چال ہی میں استعمال نہیں ہوتی بلکہ اس ملک میں روز بروز تحریر کے کام میں بھی ترقی کرتی جاتی ہے جسے ہم انڈیا (ہندوستان) کہتے ہیں جو دست میں اسی قدر بڑا ہے جس قدر براعظم یورپ۔ اسی طرح اس کا علم ادب ترقی کر رہا ہے اور اچھی اچھی تالیفات و تصنیفات سے مالا مال ہو رہا ہو۔

۱۸۵۱ء سے نئے سنگی مطبع قائم ہوئے ہیں جہاں سے دلچسپ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ نئے رسالے

اور اخبار بھی جاری تھے ہیں اور پُرانے تقریباً سب کے سب زندہ ہیں۔

اس اطلاع کی بنا پر جو میرے دوستوں اور ایک انگریزی اخبار (فرینڈ آف انڈیا) نے اپنی عنایت سے مجھے بھجوا دی ہے میں ممالک مغربی و شمالی کے ان مطابع کے متعلق صحیح تفصیل آپ کے سامنے بیان کر سکتا ہوں جو ۱۸۵۲ء کے آغاز میں وہاں جاری تھے۔ ممالک مغربی و شمالی رقبے میں فرانس سے دو چند ہیں اور وہاں کی زبان ہندوستانی ہے، خواہ اردو ہو یا ہندی۔ افسوس ہے کہ میں آپ کو راجپوتانہ، دکن، اودھ اور انگریزی احاطوں کے تینوں دارالحکومتوں کے متعلق کوئی نئی بات نہیں بتا سکتا۔ تاہم جو بزدلی تفصیل میں آپ کے سامنے پیش کروں گا اس سے آپ اس ادبی تحریک کا اندازہ کر سکیں گے جو اس زبان کے ذریعہ سے جس کے حاصل کرنے کے لئے آپ یہاں آئے ہیں، ہندوستان میں حقیقی طور پر ظاہر ہو رہی ہے نیز آپ بھی قیاس کر سکیں گے کہ زمانہ دراز سے اُس نے ایک حیثیت اور اہمیت حاصل کر لی ہے۔

۱۸۵۲ء کے آغاز میں ممالک مغربی و شمالی کے پندرہ شہروں میں ۳۴ سنگی مطبع تھے جن میں ہندوستانی مطبوعات شائع ہوتی تھیں اور ۳۱ ہندوستانی رسالے اور اخبار تھے مطبوعوں کی تفصیل یہ ہے۔ (۷) اگرہ میں (۶) دہلی میں (۲) میرٹھ میں (۲) لاہور میں (۷) بنارس میں اور ایک ایک سرحد سے۔ بریلی۔ کانپور۔ مرزا پور۔ انور۔ لدھیانہ۔ بھرت پور۔ امرتسر اور ملتان میں۔

ان مطبوعوں سے مفصلہ ذیل ہندوستانی اخبار شائع ہوتے ہیں :- اگرہ سے ”مطبع الاخبار“ جو شہر گڑھ میں خوب بکتا ہے ”اخبار الحقائق“ جو ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے اور ”اسد (اسعد) الاخبار“ جو ہفتہ میں ایک بار نکلتا ہے۔ ایک اور اخبار اسی شہر سے نکلتا ہے جس کا نام قطب الاخبار ہے جس میں مذہب اسلام کے متعلق بحث ہوتی ہے اس میں اخبار (احادیث) اسلام۔ انبیاء۔ شہداء اور اولیائے اسلام کے حالات شائع ہوتے ہیں اور قدیم مصنفین کی کتابوں میں سے اقتباسات بھی درج کئے جاتے ہیں۔ ”معیار الشرائع“ ایک ادبی رسالہ ہے جس میں قدیم و جدید شعرا کا کلام درج ہوتا ہے۔

”اخبار النوازع“ (؟) پہلے ایک علمی پرچہ تھا۔ مگر اب معمولی خبروں کا اخبار ہے۔ ”اگرہ گورنمنٹ گزٹ“ کا ذکر بھی مناسب خیال کرتا ہوں۔ یہ سرکاری اخبار ہے اور ہندوستانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع

ہوتا ہے۔ اب اگر ہم دلی کی طرف رجوع کریں تو وہاں ”سراج الاخبار“ جو اس شہر کا سب سے پرانا اخبار ہے ”دہلی اردو اخبار“ اردو میں چھپتا ہے۔ ”مظہر الحق“ کے اڈیٹر ایک صاحب محمد علی ہیں جن کی اسی نام کی ایک تالیف ہے جس میں مذہب اسلام کی مختلف رموز کا ذکر ہے۔ ”قران السعید“ ایک بالصور اخبار ہے جس میں سائنس، ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے اس کے چند نمبر جو میرے پاس آئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالصور رسالہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ہم وطنوں میں مغربی معلومات کو شائع کرے۔ اس میں خبریں بھی چھپتی ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار پیر کے روز شائع ہوتا ہے اور ایک ماہانہ رسالہ بھی جس کا نام ”فوائد النظارین“ ہے۔ اس میں علاوہ خبروں کے مضامین بھی چھپتے ہیں جو انگریزی ذرائع سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ ”دقیق اللغات“ ہندوؤں کا ہے۔

میرٹھ میں دو ہندوستانی اخبار ہیں۔ ایک ”مفتاح الاخبار“ جس کے اڈیٹر محبوب علی ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی لغت اللغات کا خلاصہ بھی لکھا ہے جو لکھنؤ میں ۱۲۸۴ء میں طبع ہوا دوسرا ”جام جہاں نما“ ہے یہ جمشید کے اُس پاپے کی طرف اشارہ ہے جس کی تہ میں وہ دنیا کے تمام واقعات جو گزرتے تھے معلوم کر لیتا تھا۔ اس اخبار میں علاوہ معمولی خبروں کے سرکاری گزٹ اور ممالک مغربی و شمالی کی عدالت عالیہ (سوپریم کورٹ) کے فیصلوں کے اقتباسات بھی درج ہوتے ہیں اس کے ساتھ ایک ورق بطور ضمیمہ کے شائع ہوتا ہے جس میں فیضی کی مباحثات کا فارسی ترجمہ شائع ہوتا ہے یہ ضمیمہ اخبار کے خریداروں کو مفت نذر کیا جاتا ہے

بنارس میں چھ ہندوستانی اخبار ہیں۔ ان میں سے دو اخباروں کا ایک ہی اڈیٹر ہے۔ ایک ہندی یعنی دیوگری حروف میں دوسرا دو یعنی فارسی حروف میں شائع ہوتا ہے۔ پہلے کا نام ”بنارس اخبار“ ہے۔ سنا ہے کہ راجہ پنپال سے ادا ہوتی ہے جن کی رانی بنارس میں ہے۔ بہر حال اڈیٹر جو ایک پرورش ہندو ہے ان دونوں اخباروں میں وہ عیسائی مشنریوں کے خلاف ہندو مذہب کی پرزور حمایت کرتا ہے۔ بنارس کا تیسرا ہندوستانی اخبار ”سداگر اخبار“ ہے یہ اخبار جو انگریزی حکومت کو اچھا سمجھتا ہے پہلے ہندی اردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا مگر اب صرف ہندی میں شائع ہوتا ہے اس کی ہندی دقیق اور سنسکرت کے الفاظ سے بھری ہوتی ہے۔ اس کی اشاعت صرف تعلیم یافتہ ہندوؤں تک محدود ہے۔ چوتھا اخبار ”بانگ دہار“ ہے جس کا نام اسی نام کی مشہور کتاب پر

رکھا گیا ہے۔ یہ ہمارا ہمارے کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ ہمارا جدید ادب کے بڑے مربی ہیں اور بت سی کتا ہیں انھوں نے اپنے خیر سے چھپوائی ہیں اور خود بھی ہندوستانی اور فارسی کے شاعر ہیں۔ پانچواں اخبار ”سائین ہند“ (؟) ہے یہ دو ہفتے میں ایک بار چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحات پر چھپتا ہے اور ہر صفحہ میں دو کالم جمع ہیں علاوہ معمولی خبروں کے جو کسی قدر تفصیل سے لکھی جاتی ہیں اس میں مختلف قسم کے مضامین ہوتے ہیں۔ چھٹا اخبار ”بنارس ہرکارا“ ہے جو لٹریچر سے اب تک نکل رہا ہو۔

بریلی سے ”عمدۃ الاخبار“ شائع ہوتا ہے اس کے ایڈیٹر لکھنؤ پرشاد ہیں۔ انھوں نے چھوٹی سی علمی اور اطلاقی ساکھ پیڈیا بھی لکھی ہے اور اس کا نام ”شرقی طرز پر“ ”واعی تفریح“ (؟) رکھا ہے۔

مرزا پور سے ”خیر خواہ ہند“ نکلتا ہے یہ امریکی پرنٹنگ مشینوں کا اخبار ہے اور اس کا مقصد تبلیغ مذہب ہے۔

”شملہ اخبار“ شملہ سے شائع ہوتا ہے یہ بت اچھا اخبار ہے جسے آج کل شیخ عبداللہ مرتب کرتے ہیں یہ انگریزی ہندوستانی دونوں سے واقف ہیں۔ ہندوستانی ان کی ماہری زبان ہے۔

اندور کا اخبار۔ جو مالوہ کا دارالحکومت ہے ”مالوہ اخبار“ ہے۔ یہ آٹھ صفحات کا ہفتہ وار ہے۔ اس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے اس کے ایڈیٹر دھرم نرائن ہیں جن کی عمر صرف چھبیس ستائیس سال کی ہوگی۔ یہ بہت اچھے شاعر ہیں اور انھوں نے تل کی پولیٹیکل اکادمی (معاذات) اور انگلستان کی ایک تاریخ کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

بھرت پور صوبہ آگرہ میں ہے۔ وہاں کا اخبار ”مظہر السور“ ہے جو راجہ بھرت پور کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے۔ ”مالوہ اخبار“ کی طرح اس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے۔

اب ہم پنجاب کے اخباروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے ناموں کے دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ روشنی علم کی اشاعت میں زیادہ کوشاں ہیں۔ کیونکہ وہاں کے اخبارات کے ناموں کے ساتھ اکثر نور کا لفظ لگا رہا ہے مثلاً ”دریائے نور“ جو لاہور کا اخبار ہے۔ ایک دوسرا جو ہفتے میں دو بار شائع ہوتا ہے ”نور“ ہے۔ اس مشہور میرے کا نام ہے جو آج کل ملکہ انگلستان کے قبضہ میں ہے۔

لدیبا نہ کا اخبار ”نور علی نور“ ہے جسے محمد حسین نے ۱۸۷۷ء میں جاری کیا تھا۔ یہ اپنی ایک نظم کی وجہ سے مشہور ہیں جس میں انھوں نے فطرت کی اُن پیداواروں کو منظوم کیا ہے جن کا ذکر احادیث میں آیا ہے امرتسرے ”بلخ نور“ اور ملتان سے جیسی نام کے صوبہ کا دارالحکومت ہی ”ریاض نور“ نکلتا ہے۔

حضرات! اب میں ہندوستانی تالیف و تصنیف کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو ممالک مغربی و شمالی میں ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئیں۔ میں اس معلومات میں جو میں نے گزشتہ سال آپ کے سامنے پیش کی کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔

رومن کیتھلک نقطہ نظر سے سردہنہ ان صوبجات میں ایسا ہے جیسے محارم نخلستان۔ یہاں رومن کیتھلک مشنریوں نے مطبع قائم کر رکھا ہے جس میں حال میں علاوہ اور چیزوں کو مذہبی عقاید کی سوال و جواب کی کتاب بھی چھپی ہے۔ اگر وہ دلی کتاب سے زیادہ تفصیلی ہے۔ کئی کتابیں دعاؤں کی اور فلیورسی کے تاریخی سوال و جواب کا ترجمہ، عیسائی اولیا کے تذکرے اور کئی اور مذہبی کتابیں فارسی اور دیوناگری حروف میں چھپی ہیں۔

پرائسٹنٹوں کی مذہبی مطبوعات بلاشبہ بہت زیادہ ہیں اور اُن کی اشاعت سے اہل ہند میں رفتہ رفتہ عیسائی خیالات کی اشاعت ہوتی جاتی ہے اور اُسی کے ساتھ ابتدائی کتابیں جو انگریزی سے ترجمہ کی جاتی ہیں مغربی علوم کے پھیلانے میں مدد دیتی ہیں۔

گزشتہ سال میں نے آپ سے رام چندر کے عیسائی ہونے کا ذکر کیا تھا اور میں نے اپنے خطبہ میں اُس اخبار کا بھی ذکر کیا تھا جس کے وہ اڈیٹر ہیں۔ اس سال ایک ہندوستانی شاہزادہ کا ذکر کرتا ہوں اور صرف یہی ایک ہندوستانی شاہزادہ ہے جو ہمارے زمانہ میں عیسائی ہوا ہے۔ ہمارا جہ دلیپ سنگھ لاہور کے شاہی خاندان کا سکھ شاہزادہ ہے۔ اس نے فتح گڑھ میں گزشتہ پانچ کی آٹھویں تیاج کو عیسائی مذہب قبول کیا۔ اس وقت وہ فتح گڑھ ہی میں مقیم ہے۔

لیکن ہمیں ہندوستان کے مطابع کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھنی چاہئے۔ کیونکہ ابی سب سے بڑی چیز جو یورپ کی توجہ کی مستحق ہے ۱۸۷۷ء کے دوران میں تیس دیسی مطابع میں جس قدر کتابیں چھپی ہیں اُن کا ایک گوشوارہ تیار کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تعداد ۱۲۶ ہے جن میں سے ۸۷ ہندوستانی ہیں۔

افسوس ہے کہ اُن میں سے متعدد کتابوں کے صرف نام لکھے ہیں دوسری کسی قسم کی کیفیت درج نہیں ہے اور محض نام سے کتاب کے متعلق صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مشرقی کتب کے نام بعض اوقات اصل مضمون سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ اس لئے حضرات، میں بعض کتابوں کا تذکرہ کرنے سے معذور ہوں۔ ممکن ہے کہ اُن کا با نمانا بہت دلچسپ ہوتا۔

ہندی کتب میں سے لائق ذکر مفصلہ ذیل کتابیں ہیں جو آپ کی محتاجِ توجہ ہیں۔
 راماین کی شرح جو ہماراجہ بنارس کی فرمائش سے طبع ہو رہی تھی، جنوری ۱۸۵۲ء میں تکمیل کو پہنچ گئی
 بُجن چو تر۔ یہ کتاب راجہ بھرت پور کے حکم سے طبع ہوئی۔ اس میں اس لڑائی کا منظوم تذکرہ ہے جو
 سورج مل (جو راجہ بھرت پور کے بزرگوں میں سے تھے) اور صلاحیت خاں اور دوسرے افغان سرداروں
 میں ہوئی تھی۔

نجات المومنین۔ باوجود عربی نام کے یہ کتاب پنجاب کی ہندی بولی میں جسے پنجابی کہتے ہیں لکھی
 گئی ہے اور لدھیانہ میں چھپی ہے۔

عالم طائی ہندی منظوم بنارس میں چھپی۔ ایک ہندی انت مرتبہ نقشب دہلی میں چھپی ہے۔ یہ صاحب
 کئی کتابوں کے مولف ہیں۔ جو اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں اگر میں سرکاری مطبوعات جنٹریوں اور چوٹی
 چھوٹی مذہبی کتابوں نیز ایسی کتابوں کو جو دوبارہ چھپی ہیں اپنے تبصرہ میں شریک کر لوں تو یہ فرست آسانی
 سے بہت طویل ہو سکتی ہے۔

یہی کیفیت اردو مطبوعات کی ہے جن کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ ہندی مصنفین بھی
 زبان کی اُسی شاخ میں لکھنا پسند کرتے ہیں جسے سلمان مصنفین نے قابلِ تعریف کمال تک پہنچا دیا ہے۔

حضرات۔ اس سال میں اردو مطبوعات میں سے چند ایسی کتابوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا
 ہوں جو حقیقی طور پر قابلِ قدر ہیں۔

کانپور کا مطبع ہندوستانی مطابع میں بہت ہی معروف و مقبول ہے۔ ۱۸۵۱ء میں اس مطبع میں علاوہ
 دوسری کتابوں کے ایک نظم ”قصہ منصور“ کے نام سے چھپی ہے۔ منصور ایک مشہور حکیم (صوفی)

گزارا ہے۔ جو زیادہ تر ”حلاج“ کے نام سے معروف ہے۔ اس مشہور شخص پر جو صوفی ہے ۶۹۲ھ میں کفر کا فتویٰ لگایا اور اس جرم پر کہ وہ اپنے تئیں ”الحق“ کہتا تھا جو خدا کا نام ہے قتل کیا گیا۔ صوفیائے شہید سمجھے ہیں۔ اور ان کی تصانیف میں اس کا ذکر بہت عزت و حرمت سے کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اسے عیسائی خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ دہربوے نے اپنی کتاب ”اورتیل بیلپتیک“ میں اس کے چند اشعار نقل کئے ہیں جن سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ آخری اشعار تھے جو شہادت سے پہلے اُس کی زبان سے نکلے تھے۔

”حمد ہو ہمیشہ اس کے لئے جس نے اپنی الوہیت کو چھپا کر جو تمام دنیا میں ساری ہے، اپنی انسانیت (انسانی شکل) کو ہم پر ظاہر کیا۔ یہاں تک کہ اُس نے خواہش کی کہ وہ ہم کو کھاتا پیتا نظر آئے۔ وہ جو مجھے اپنے دسترخوان پر بلاتا ہے تو بُرائیں کرتا کیونکہ وہ مجھے وہی پیلا اپنے کو دیتا ہے جو وہ خود پیتا ہے۔ وہ حقیقت مجھ سے ایسا ہی برتاؤ کرتا ہے جیسا ایک میزبان اپنی مہمان کے ساتھ کیا کرتا ہے۔“

علاوہ اس کے اس مطبع سے مفصلہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں۔

مجموعہ ثنوی۔ یہ اردو منظوم حکایتوں کا مجموعہ ہے۔ حکایت نصیحت آمیز۔ ناز و نیاز یہ خدا اور رسول خدا (صلعم) کی حمد و ثنائیں ہے۔ یہ اُسی قسم کی کتاب ہے جو اگرہ میں نظم نادر کے نام سے شایع ہوئی ہے بگلستانِ سرشت یہ شعرا کے کلام کا مجموعہ ہے جو اس مطبع کے روشن خیال مالک نے انتخاب کیا ہے۔

اب ان اردو کتب کی طرف آپ کی توجہ منحطف کرتا ہوں جو دوسرے مطبعوں سے شایع ہوئی ہیں۔ اُن میں سے ایک عربی کی مشہور کتاب ”مقامات حریری“ کا اردو ترجمہ ہے۔ دہرم سنگھ کا قصہ جو ایک کپکپ قصہ ہے۔ بوعلی قلندرؒ کی فارسی ثنوی کی شرح۔ بہارستانِ سخن جو تاج، آتش، آباد کے کلام کا مجموعہ ہے۔ میزانِ عقوبتی، یہ فارسی کتاب کا ترجمہ ہے تاکہ لوگ کثرت سے مستفید ہو سکیں۔

اس سال کے شروع میں پنجاب کے ایک اخبار نے ایک جدید کتاب کی اطلاع شائع کی ہے یہ میجر ایڈورڈ کی کتاب ”پنجاب میں ایک سال“ کا ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم نواب امام الدین ہیں جو پہلے کشمیر لہ یہ فارسی شعرا کے کلام کا انتخاب مضامین کی ترتیب سے ہو۔ پروفیسر موصوف غفلی سے اسے اردو خیال کرتے ہیں (اڈنبر)

کے گورنر تھے اور جنہوں نے کابل کے محاصرے اور دوسری لڑائیوں میں نمایاں کام کئے ہیں۔
 میں ان جزائی نقشوں کا ذکر نہیں کروں گا جو مختلف مطبوعوں میں چھپے ہیں۔ ہر کلاس اور مین کے نقشوں
 کے بعدے ممالک مغربی و شمالی کے مطاب میں نہ صرف دنیا کے نقشے بلکہ ہندوستان اور ہر ضلع کے نقشے
 چھپ کر شایع ہوئے ہیں۔

میں اپنی تعلیم کے دوران میں کئی سال تک ”ہندوستانی انتخابات“ پڑھتا رہا ہوں۔ یہ عمدہ انتخاب فاضل
 مسٹر شکسپیر کا کیا ہوا ہے اور اس وقت ایٹ انڈیا کمپنی کے کاجوں کے نصاب میں داخل تھا۔ اب اس کی جگہ
 طوطا لکانی اور باغ و بہار رکھی گئی ہیں۔ اس سال میں ان کتابوں کی تعلیم دوں گا۔ نہ صرف ان انگریزوں کے فائدہ
 کو خیال سے جو میرے پگڑوں میں حاضر ہوتے ہیں بلکہ اس خیال سے کہ اردو میں ان کتابوں کا طرز تحریر نہایت پاکیزہ
 اور لطیف ہے۔ یعنی یہ ہندوستان کی اس خوبصورت زبان میں لکھی گئی ہیں جس میں فارسی اور اس کی ہمیں عربی و ہند
 کے ساتھ شریک ہیں ان کتابوں میں استعارات اور دیگر صنائع و بہار و لفظی مناسبت کا صرف ایک حد تک
 اہمال کیا گیا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے اہل مشرق بہت شایق ہیں۔

ان میں سے پہلی کتاب سے آپ واقف ہیں کیونکہ اس کا ترجمہ (*Tales of a Parrot*) کے نام
 سے ہو چکا ہے۔ لہذا اس کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرا ایک مشہور قصہ ہے۔
 اور ہندوستان میں یہ قصہ کئی صاحبوں نے لکھا ہے۔ ان سے باغ و بہار نام کا بہت قابل قدر ہے
 اور ہندوستان میں اس قدر مقبول ہوا کہ بار بار چھپا ہو۔ اور اس میں کاکا کا قصہ ارمی زبان میں بھی ہوا ہے۔ علاوہ
 اہل اوتوں کے اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اردو و ہندی کی بہت سی ضرب المثلیں اور اشار بھی جگہ جگہ آتی ہیں۔
 اس کا نام باغ و بہار کسی قدر عجیب ہے۔ نو مصنف نے اپنے دیباچے میں اس کی وجہ تسمیہ ان الفاظ میں بیان
 کی ہے :

”ہم نام عجیب اس میں نکلتی ہے۔ تب میں نے یہی نام رکھا جو کوئی اس کو پڑھے گا گویا باغ کی سیر کرے گا“
 جیسا کہ اکثر مشرقی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اس قصے میں کئی اور قصے شامل ہیں اور (*Orlando Furioso*)
 کی طرح قصے کا انجام عام ہے جس میں قصے کے تمام خاص اشخاص شریک ہیں۔ یہ کتاب کئی شخصوں کی عجیب

وغریب آپ بیتیوں کا مجموعہ ہے جن میں عجائب نگاری کی شان ہر جگہ پائی جاتی ہے اور باوجود بار بار اعادہ کے اہل مشرق اسے بہت پسند کرتے ہیں مگر اس سے درحقیقت اکثر اوقات قصوں کا لطف کم ہو جاتا ہے۔ ایک خوشی کی بات یہ ہے کہ اس میں ”اسلامی عجائبات“ بھی آجاتے ہیں جو زیادہ قابل قبول اور شعی بخش ہیں۔

حضرت - میں اب آپ سے باغ و بہار کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ تاکہ آپ کے خیال میں کتاب کا ایک تصور پیدا ہو جائے اور اصل کتاب کے پڑھنے میں آسانی ہو (اس کے بعد کتاب کا خلاصہ ہی جو غیر ضروری سمجھ کر ترجمہ میں چھوڑ دیا گیا)۔

میں نے مختصر طور سے باغ و بہار کا خاکہ آپ کے سامنے کیچھن دیا ہے۔ لیکن اس کتاب کے پڑھنے وقت آپ بہت مفید اور کارآمد بات یہ پائیں گے کہ ان قصوں میں ہر فقرہ پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اصلی ہندوستان اور خاص کر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہوں گی۔ اس قسم کی باتیں قصے کے ہر صفحے میں پائی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ مذہبی جوش اور ظلم کی کارستانی اس ناگوار طریقہ سے بیان کی گئی ہیں کہ وہ حصے کسی قدر خلاف قیاس معلوم ہوتے ہیں، لیکن بہت سے حصے ایسے ہیں کہ ان کا جوڑ بڑی خوبصورتی سے بٹھایا گیا ہے اور درحقیقت بہت دلچسپ ہیں۔

لہذا حضرات اس کتاب میں آپ اس زبان کا مطالعہ کریں گے جو خاص طور پر ہندوستانی کہلاتی ہے اور اس میں آپ ان الفاظ کو نہیں پڑھیں گے جن کا کوئی مفہوم نہیں، بلکہ ایسے الفاظ دیکھیں گے جو ان اشار کا مفہوم بتاتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں اور جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے آپ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی پائیں گے اور وہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ خیالات کی نیابت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تجزیہ کرنے سے ہم ان مادوں تک پہنچتے ہیں جو انڈو یورپین زبانوں کے ایک بہت بڑے مجموعہ کی کنجی ہیں اور خود ہماری زبان بھی انھیں میں شامل ہے اور درحقیقت ہندوستانی کی ایک بہن ہے۔

پیارا پیارا گھر اپنا

(نتیجہ فکر جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب -۔ تی۔ اے)

- ۱۔ وہ چین کہاں اپنے گھر کا وہ بات کہاں اپنے گھر کی
پیارا پیارا گھر اپنا
وہ راج کہاں اپنے گھر کا وہ رات کہاں اپنے گھر کی
آنکھوں کا تارا گھر اپنا
- ۲۔ مسکے مین اگر دنیا میں ہے اپنے ہی گھر میں ملتا ہے
سکھ کا سہارا گھر اپنا
دُکھ درد کی گر کوئی دوا ہے اپنے ہی گھر کی سیوا ہے
دکھ کا مداوا گھر اپنا
- ۳۔ وہ گھر والی سُنذر چتر گھر کی سیوا کرنے والی
دل کا دلاسا گھر اپنا
آرام ہمیں دینے والی آپ مصیبت بھرنے والی
جان سے پیارا گھر اپنا
- ۴۔ آنکھوں کے تارے لاڈ لے گھر کے سب ل کر گھر سر پہ اٹھاتے
دودھوں نہا یا گھر اپنا
کھیلے ہنستے روٹھتے سنتے کبانی سوتے سلاتے
بسا بسا یا گھر اپنا

- ۵۔ ہم پر جان چھڑکنے والا وہ پروان چڑھانے والا
 پالنے والا گھر اپنا
 وہ بلوان بنانے والا وہ انسان بنانے والا
 ڈھانے والا گھر اپنا
- ۶۔ وہ پاک ہوا اپنے گھر کی پیار کی جلا اپنے گھر کی
 دل میں سما یا گھر اپنا
 ایثار و فدا اپنے گھر کی وہ درد دیا اپنے گھر کی
 روح پہ چھایا گھر اپنا
- ۷۔ جڑ بنیاد وطن کی گھر ہے وطن گھروں کا اپنے گھر ہے
 اپنے گھروں کا گھر اپنا
 اپنے گھر پہ نثار وطن ہے اور وطن کے صدقے گھر ہے
 وطن کا شیدا گھر اپنا
- ۸۔ وطن کی چاہت اپنے گھر سے وطن کی طاقت اپنی گھر سے
 وطن کا پیارا گھر اپنا
 وطن کی دولت اپنے گھر سے وطن کی عزت اپنے گھر سے
 راج دُلا را گھر اپنا

غالب کے نئے کلام کا انتخاب

(انجناب مولوی سید ہاشمی صاحب کن دار الترجمة عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

کچھ عرصہ ہو اُن کے اردو میں ہم مرزا غالب کے غیر مطبوعہ یا نئے کلام پر جو نسبتِ حمید یہ میں چھاپا ہے تبصرہ کر چکے ہیں۔ اس کلام کو بغور دیکھنے سے ہمارا یہ خیال درجہ یقین کو پہنچ گیا کہ مرزا غالب کے ابتدائی زمانہ کے اکثر اشعار اگرچہ مشکل ہیں مگر تلف کرنے کے لائق نہیں ہیں، اور اگر سلیقے کے ساتھ ان کی شرح لکھ دی جائے تو دیگر ”اساتذہ اردو“ کے کلام کی نسبت ان شعروں میں قبولِ خاطر کی صلاحیت کچھ کم نہ بچے گی۔ اس قسم کی مفصل شرح کا تو نہ معلوم کب موقع آئے گا، سردست جناب اڈیٹر صاحب اردو کے فرمانے کے مطابق ہم اس کلام کا ایک سرسری انتخاب ناظرین اردو کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس میں جہاں تک ہوا آسان شعر چنے ہیں اور پہلے اُن اشعار کو لیا ہے جن کی ہم طرح غزلیں متداول دیوان میں موجود تھیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ وہ شعر ہیں جنہیں حسب روایت مرزا صاحب کے دوستوں نے قلمزں کیا تھا۔ اور گو ان حضرات نے اس انتخاب میں کمال دیانت و قابلیت سے کام لیا ہو، بایں ہم جیسا کہ اپنے تبصرے میں عرض کر چکے ہیں انہوں نے اپنے انفرادی ذوق اور کچھ اہل زمانہ کے عام رجحان کے اثر سے بعض وہ شعر بھی خارج کر دیئے جو آج کل ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہ سمجھے جائیں گے۔

ان اشعار کے بعد ان غزلوں کا انتخاب کیا ہے جن کا کوئی ہم طرح شعر متداول دیوان میں نہ تھا۔ اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، ظاہر یہ ابتدائی عمر کا وہی کلام ہے جس کی نسبت مرزا صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ پندرہ برس کی عمر پہ پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تیز رفتاری تو اس دیوان کو دود کیا اور اوراقِ یکلم چاک کئے دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان میں رہنے دیئے، یہی سبب تھا کہ بہت سے صاف اور اچھے شعری انجی اوراق کے ساتھ اتنے عرصہ تک

۴۱۴
خوبے نشان رہی جنہیں کمال بے دردی سے 'یک قلم چاک' کر دیا گیا تھا۔

(۱)

(اُن اشعار کا انتخاب جن کی ہم طرح غزلیں متداول دیوان میں موجود ہیں)
تنگی، رفیقِ رہتی عدم یا وجود تھا میر اسفر بہ طالع چشمِ حسود تھا
خورِ شبنم آشنا نہ ہوا در نہ میں اسد سرتاقدم گذارشِ ذوقِ سجد تھا!

ہر کماں تمنا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پایا
خاکبازی اُمید کا رخنہ طفلی یاس کو دو عالم سے لبِ بجمدہ وا پایا
شبِ نظارہ پر درتھا خواب میں خیال اس کا صبحِ موجبِ گل کو نقشِ بوریایا پایا

کارخانے سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا میری قیمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا
سناغرجوہِ سرشار ہی ہر ذرۂ خاک شوقِ دیدارِ بلا آئینہ سا ماں نکلا
یعنی خود شوقِ دیدار نے اس بلا کی قابلیتِ عکس معشوق لینے کی پیدا کر دی ہے۔
دیدہ تاولِ ہر ایک آئینہ چراغاں کس نے غلوتِ ناز پہ پیرایہِ محفلِ باندھا؟
مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب ساز پر رشتہ پئے نعمتِ بیدل باندھا

اس غزل کا صرف مقطع متداولِ دیوان میں رہ گیا باقی چھ شعر انتخاب کرنے والوں نے خارج کر دیئے

نہیں سے چار نیچے دج ہیں :-

نہ بولا اضطرابِ دم شمار، انتظار اپنا کہ آخر شیشہِ ساعت کے کام آیا غبار اپنا
دیں آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا چراغِ گل سے ڈھونڈے ہی ہمن میں شمعِ خار اپنا
- ایسے بے زباں ہوں - کاٹکے متیا دبے پروا بہ دامِ جوہر آئینہ ہو جائے شکار اپنا

اگر آسودگی ہے مدعاے رنجِ بیتابی نثارِ گردشِ ہمایہ سے روزگار اپنا!

مقطع

اسد ہم وہ جنوں جولاں گداے بے سرو پا ہیں کہ ہی سر پہ بزمِ نرگانِ آہوشتِ خار اپنا

یہاں اس مبطوعہ قطع کو نقل کرنے سے ہمیں یہ دکھانا مقصود ہی کہ بعض دفعہ انتخاب کرنے والوں نے
آسان شعروں کو کاٹ کر سچیدہ کو باقی رکھا ہے! ۷

نہ پائی وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم نے عدم کو لے گئے دل میں غبڑا صحر اکا
مراشتمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہی میں مدعا ہوں تپشِ نامہ متنا کا

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپشِ در بھی دُور تھا اک، گھر میں، مختصر سا بیا باں منور تھا
لے لے وائے غفلتِ نگہ شوقِ اور نہ یاں ہر بارہ رنگ، نختِ دل کو وہ طور تھا
درسِ تپش ہی برق کو اب اس کے نام سے وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص ”صبور“ تھا
ہر رنگ میں جسلا اسدِ فتنہ انتظار پردانہ تجلی شمعِ ظہور تھا

ربطِ یک شیرازہ وحشت ہیں اجڑاے بہار سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا!

اس کے بعد آگے جا کر تم کی ردیف میں چند شعر اس قابل ملتے ہیں کہ متداول دیوان کی غزل میں
انہیں شامل کر لیا جائے:-

فرطِ بختِ بانی سے ہیں شب ہائے ہجر یار میں جوں زبانِ شمع، دماغِ گرمیِ افسانہ ہم
جانے ہیں جوشِ سوداے زلفِ یار میں سنبلِ بالیدہ کو موئے سرِ دیوانہ ہم
بسکہ وہ چشمِ و چراغِ محضِ غبار ہی چمکے چمکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم

اِس جوش انگیز منقطع کو بھی انتخاب کرنے والوں نے خارج کر دیا تھا کہ
قطرہ ہائے خونِ بسلِ زیبِ داماں ہیں، اسد ہے تماشا کردنی گلچینی جُبلادیاں

ذیل کے شعروں میں سے مطلع خود مرزا غالب نے گل رعنا کے چہرہ اشعار میں داخل کیا تھا
ہر نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن
وقتِ ہیگر بلبلِ مسکین زلیخا ہی کرے یوسفِ گلِ جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چمن

پھر حلقہ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں جوں دودِ فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں
پایا سر ہر ذرہ جسگر گوشتِ وحشت ہیں دلخ سے معمورِ شغلیاتی کی کلاہیں
دیرِ حرم آئینہ تکرارِ تمنا واما ندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں !
”تکرارِ تمنا“ میں مایوس رہ جانے کا بھی کنا یہ تھا اسی لئے دوسرے مصرعے میں وضاحت کی اور یہ نادر
مضمون پیدا کیا کہ عشقِ حقیقی تو اس طلب کا نام ہے جس کی اِس دنیا میں کوئی نہایت نہیں۔ پس یہ سالک
کے تھک جانے کی دلیل ہے کہ وہ دیر یا حرم کو اپنی منزلِ مقصود قرار دے لے۔

ہر چند عمر گزری آزر دگی میں لیکن ہی شرحِ شوق کو بھی جو شکوہ ناما می
ہو یاں میں اسد کو ساتی سے بھی غمت دریا یا خشک گزری مستوں کی تشہ نامی

ذیل کی غزل کا بے نظیر مطلع اور کئی شعر انتخاب کرنے والوں نے خارج کر دیئے تھے :-
نظر بہ نقص گدایاں کمال بے ادبی ہے کہ خارِ خشک کو بھی دعویٰ چمنِ نسبی ہے
ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ لبِ قہج پہ کفِ بادہ جوشِ تشہ لبی ہے
مرزا کی عالی ظرفی ہمیشہ ”دل بے دعا“ مانگتی ہی لیکن ”معا طلبی“ کے جو اسباب انہوں نے گنوائے ہیں

وہ باریک بینی کی انتہا ہی۔ فرماتے ہیں :-

خوشا وہ دل کہ سراپا طلسم بے خبری ہو جنونِ دیاس و آلم رزقِ مدعا طلبی ہو
چمن میں کس کے یہ برہم ہوئی ہو بزمِ تماشا کبرگِ برگِ سمن شیشہ ریزہٴ حلسی ہو

ذیل کی غزل میں سے صرف دو شعر خارج کئے گئے تھے۔ وہ دونوں ہم نقل کئے دیتے ہیں :-
ظاہر ہو طرزِ قید سے صیاد کی غرض جو دانہ دام میں ہو سوا شکِ کباب ہو
بے چشم دل نہ کر ہو بس سیرِ لالہ زار یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہو
کباب میں سے جو پانی رستا ہو اسے ”اشکِ کباب“ کہتے ہیں اور وہی جم کر دانہ بن جاتا ہو۔

کہوں کیا اگر مجوشی محو کشی میں شمعِ رویاں کی کہ شمعِ خانہٴ دل آتشِ مے سے فردزاں کی
ہوا شرمِ تہی دستی سے وہ بھی سرنگوںِ آخر بس اے زخمِ جگر اب دیکھ لی شورشِ نکلداں کی
یہ یادِ گرمیِ صحبتِ بزمِ شعلہ دہکے ہو چھپاؤں کیوں کہ غالبِ سوزِ شیںِ داغِ نمایاں کی؟

”آئینہٴ زانو مجھے“ والی غزل کا مطلع، جو بجائے خود فلسفہٴ زندگی کا رسالہ ہو، یہ تھا :-
باعثِ واما ندگی ہو عمرِ فرصت جو مجھے کر دیا ہے پایہٴ زنجیرِ رمِ آہو مجھے
”رمِ آہو“ سے شاعر نے زنجیرِ زنداں تیار کی ہو اور یہ بالکل نئی تشبیہ ہو۔ شعر کا مقصود یہ ہے کہ قیمتِ یا
فطرت ہی نے مجھے مجبور کر دیا ہو کہ فرصت و فراغت کی تلاش کروں لیکن خود یہ تلاش فرصت کی ضد ہو اور
تھکا دینے کے لئے کافی ہو۔

روحِ نشہ ہو سرتا قدمِ قدِ چمنِ رویاں بجائے خود و گرنہ سرو بھی مینا سے خالی ہو
یہی سستی ہو اہلِ خاک کو ابرِ بباری سے نہیں جوشِ طرب سے جامِ لبرِ زہِ سفالی ہو

اسد اٹھنا قیامت قاتلوں کا وقت آرائش لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے!
 صنِ تخیل اور قوتِ بیان کے اعتبار سے مجھے اُمید نہیں کہ اُردو شاعری میں مندرجہ بالا مقطع کی کوئی
 نظیر آسانی سے میسر آجائے! ۱۰

بہو جہاں تیرا دماغ ناز مستِ بے خودی خوابِ نازِ گلرخاں دودِ چراغِ کشتہ ہری
 تیرے ہیں رکھتی ہر شرمِ قطرہ سآنی مجھے مہج گردابِ حیا ہے چسپنِ پشانی مجھے
 شوقِ ہوشِ لبِ حباب از غیشِ بیرون آمدن ہے گریباں گیرِ فرصتِ ذوقِ عریانی مجھے

غم و عشرت قدِ مہوسِ دلِ تسلیمِ آمیں ہے دُعاے دُعا گم کرو گانِ عشق "آ میں" ہے
 پیامِ تعزیت پیدا ہے اندازِ عیادت سے شبِ ماتم تہ داماں دودِ شمعِ بایں ہے

اسد کو حسرتِ عرضِ نیازِ قہقہہ دمِ قتل ہنوز یک سخن بے صدا نکلتی ہو!
 "سخن" کا لفظ بیاں مونسِ بندِ حیا ہے آج کل عام طور پر مذکور ہوتے ہیں۔ اور "سخن بے صدا" کے
 معنی محض ایک کیفیت کے رہ جائیں گے۔

(۲)

(اُن غزلوں کا انتخاب جن کا کوئی شعر متداول دیوان میں نہ تھا)

برہنِ شرمِ ہوا وصفِ شہرتِ اہتمامِ اس کا نگیں میں جوں شرارِ رنگِ ناپیدا ہے نام اس کا
 اسد سودائے سرسبزی سے ہر تسلیمِ رنگیں تر کہ گشتِ خشکِ اس کا، ابر بے پروا خرامِ اس کا
 یہ مطلع اور مقطع دونوں لاجواب اور نہایت وسیع معانی کے حامل ہیں۔ پہلا شعر مولانا حسرت گل رعنا سے

۱۔ لہ نہمِ حمید یہ میں یہ لفظ "شوق" چھپا ہی۔ میں نے "شوق" بنا دیا۔

نقل کر کے چھاپ چکے ہیں لیکن ان کے ہاں ”شہرت“ کی جگہ ”شوخی“ کا رنگین تر لفظ تحریر ہے۔

آخر کار گرفتِ سرِ زلف ہو ا دلِ دیوانہ کہ وارستہ ہر مذہب تھا
شوق، سامانِ فضولی ہو کر نہ غالب ہم میں سرمایہٴ ایجادِ تنائب تھا

یک گام بنجودی سے لٹیں غبارِ صحرا آغوشِ نقشِ باہیں کیجے فشاِ صحرا
دشتِ اگر ساری بے حاصلی ادا ہو پیمانہٴ ہوا ہے مشتِ غبارِ صحرا
لے آبلہ کرم کرایاں رنجِ اک قدم کر لے لور چشمِ اُلفت لے یادگارِ صحرا
دیوانگی اسد کی حسرتِ کنِ طرب ہو در سر ہوا کے گلشنِ دردِ دلِ غبارِ صحرا

دشتی بن صیاد نے ہم رمخوروں کو کیا رام کیا رشتہٴ چاکِ حبیبِ دریدہ صرفِ تماشاںِ دام کیا
نہ بجائے نامہ، لگا ہی بر لبِ پیکِ نامہ رساں قاتلِ تمکینِ سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

سیر آں سوئے تماشا ہی طلبِ گاروں کا خضرِ شاقِ ہوا اس دشت کے آواروں کا
داد خواہِ تپش و مہرِ خوشی بر لب کاغذِ سرمہ ہی جامہ ترے بیماروں کا
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا
جلوہِ مایوس نہیں دلِ نگرانی، غافل چشمِ امید ہی روزن تری دیواروں کا
تیسرا شعر مرزا صاحب نے خود انتخاب کر کے گلِ رعنا میں دج کیا تھا اور مولانا حسرت کے ہاں چھپکا
ہی۔ اور چوتھے شعر میں ”دلِ نگرانی“ سے دلی نگرانی یا آرزو سے حقیقی مراد ہے۔

ذیل کی ہوائی غزل ہم پہلے اپنے تبصرے میں نقل کر چکے ہیں چند شعریاں انتخاب کرتے ہیں:-

بہ نثر نامہ جو بس گلِ پیام رہا
ہو نہ مجھے بجز درد حاصل صیبا
دل و جگر ترفِ فرقت سے جل کے خاک ہو
شکستِ رنگ کی لائی سحرِ شبِ نبل
ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
بسانِ اشک گرفتارِ چشمِ دام رہا
وے ہنوز خیالِ وصالِ خام رہا
پر زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا، یہی
حیرتِ ہمہ اسرارِ پر مجبورِ خموشی
کس بات پہ معذور ہی اے عجزِ تمنا
آہنگِ اسد میں نہیں بجز نغمہ بیدل
رقارِ نہیں بشیر از لغزشِ پا پہیچ
ہستی نہیں بجز بستیِ پیمانِ وفا پہیچ
سامانِ دعا، وحشت و تاثیرِ دعا پہیچ
عالمِ ہمہ افسانہ ما دارد و ما پہیچ

لے نوا سازِ تماشا بسرِ کیفِ جلتا ہوں میں
شمعِ ہوں لیکن بسا در رفتہ خارجِ جستجو
اک طرف جلتا ہی دل اور اک طرف جلتا ہوں میر
مدعا کم کردہ ہر سو ہر طرف جلتا ہوں میں

قنادگی میں قدمِ استوار رکھتے ہیں
جنوںِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہی غالب
برنگِ جادہ سر کو یاد رکھتے ہیں
بسانِ دشتِ دل پر عبا رکھتے ہیں

گریاں سر نہ کھینچنے تلخیِ عجبِ فضا ہی
نے حسرتِ تسلی نے ذوقِ بقیاری
ہر نالہ اسد ہے مضمونِ دادِ خواہی
وسعتِ گہ تنہا یک نامِ و صد ہوا ہی
یک درد و صد دوا ہی یک نرتِ صدا ہی
یعنی سخن کو کاغذِ اسرارِ مدعا ہی

نفسِ بہ نالہ، رقیبِ دنگہ بہ اشک، عدد
زیادہ اُس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے!

زباں سے عرضِ تنائے خامشی معلوم
مگر وہ حسانہ برانداز ”گفتگو“ جانے؟

غذا رِ یارِ نظر بندِ چشمِ گریاں ہے
عجب کہ پر تو خورِ شمعِ شبنمِ تارِ ہی
کشورِ غنچہ ولما عجب نہ رکھ، غافل
صبا خرامیِ خواں ہمارا ساں ہی

فرست، آئینہ صدرِ رنگِ خود آرائی ہی
روز و شب یک کفنِ افسوسِ تاشائی ہے

نوائے خفتِ الفت اگر بیتاب ہو جائے
پر پروانہ تارِ شمع پر مضرب ہو جائے
برنگِ گل اگر شیرازہ بندِ بخودی رہے
ہزار آشتِ گلیِ مجسمہ یک خواب ہو جائے
اسد باوصفِ عجز و بے تکلف خاک گردین
غضب ہی گرجِ خاطرِ اجاب ہو جائے

تا چند نازِ مسجد و بُت خانہ کیچنے
جوں شمع، دل بہ خلوتِ جانانہ کیچنے
عجزِ نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو آج اس کے حرفِ نیا نہ کیچنے!
ہو ذوقِ گریہ عزمِ سفر کیجے اسد
رختِ جنوںِ سیل بہ ویرانہ کیچنے

گل سر بہ اشارہِ حبیبِ دریدہ ہے
نازِ بارِ جز بہ تفتِ آستانہ کیچنے
گر صفحے کو نہ دیکھے پردا زِ سادگی
جز خطِ عجزِ نقشِ تنائے کیچنے
خود نامہ بن کے جائے اُس آشنا کی پک
کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کیچنے

پر طائوسِ تماشائِ نظر آیا ہی مجھے
کس کا دل تھا کہ بعدِ چشم دکھایا ہی مجھے
جامِ ہر ذرہ ہی سرشارِ تنائے مجھے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہی مجھے

جوشِ فریادِ سولوگ دیتِ خوابِ اسد شوخیِ نغمہٗ بیدل نے بجایا ہی مجھے

فسردگی میں ہی فریادِ بیدلاں تجھے چراغِ صبحِ وگلِ موسمِ خزاں تجھے
نیازِ پردہٗ اظہارِ خود پرستی ہی جبینِ سجدہٗ فناں تجھے، آتاں تجھے!

رنجشِ یارِ مہرباں عیشِ وطرب کا ہی نشانا دل سے اٹھا ہی جو غبارِ گردِ سوادِ باغ ہے
شعر کی فکر کو اسد چاہیئے ہے دل و دماغ عذر کہ یہ فردہٗ دل بے دل بے دماغ ہی

مرزا غالب کے اُس کلام کا جو مدتِ دراز تک بے نشان رہنے کے بعد اب روشنی میں آیا ہے، سہرِ
یہ مختصر انتخابِ شایقین کو اس طرف متوجہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس نمونے کو دیکھ کر بھی اس بات کا کچھ نہ کچھ
اندازہ ہو سکے گا کہ مرزا کی اُردو شاعری کن کن مراحل سے گزری ہے۔ ان کے ابتدائی کلام میں بے شبہ بعض
خامیاں ہیں لیکن انہی خامیوں کی تہ میں شاعر کی حیرت انگیز وسعتِ نظر اور تخیل کی وہ خدا داد قوت اور بلندی
نظر آتی ہے جن کی بدولت یقین ہے کہ غالب کا شمار ایک دن دُنیا کے چند بہترین شعرا میں ہو کر رہے گا۔

یہودی (از روسی مصنف ٹرگی نف)

(مترجمہ جناب سید فضل حسین صاحب)

—•••—

”کرنل صاحب، آج تو ہمیں کوئی قصہ سنائیے۔“ ہم نے آخر کار نکولے ایلچی سے فرمائش کی۔
کرنل مسکرایا۔ سگرا کا کش لے کر اس ترکیب سے دھواں چھوڑا کہ وہ بل کھاتا ہوا اس کی موچھوں کے درمیان سے بھٹنے لگا۔ اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ہم پر ایک نظر ڈالی اور آنکھیں بند کر لیں گویا کچھ سوچ رہا ہے۔ نکولے سے ہم لوگ بہت مانوس تھے اور اس کا ادب کرتے تھے، کیوں کہ زندہ دل اور خوش مذاق انسان ہونے کے علاوہ وہ خصوصاً ہم نوجوانوں سے بہت ہی شفقت اور بے تکلفی سے پیش آتا تھا۔ وہ کشیدہ دقامت، فراخ سینہ اور قوی الجذہ آدمی تھا۔ اس کا سانولا اور شاندار روسی چہرہ، اس کی آنکھیں جن سے ذہانت اور راستی ٹپکتی تھی، اس کی زیر لب مسکراہٹ، اس کی بلند مگر ملائم آواز، غرض اس کی ہر بات ملنے والوں کے دل کو خوش کرتی اور اپنی طرف کھینچتی تھی۔
”اچھا تو سنئے، اس نے شروع کیا۔

سلسلہ کا واقعہ ہی۔ ہم نے ڈنبرگ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس وقت میرا تعلق سپردار سواروں کی رجمنٹ الہی ... سے تھا اور مجھے یاد ہے، میں نے انہیں دنوں میں کارنٹ (سب لفٹ) کے درجہ پر ترقی پائی تھی۔ لڑائی ... ایک تفریق بخش مسئلہ ہے اور سربراہی کی فہمیں بھی بجائے خود دلچسپی سے غالی نہیں ہیں، مگر محاصرہ کن فورج میں سپاہیوں کو غضب کی کاہلی سے سابقہ پڑتا ہے۔

دن بھر کسی خندق یا خیمے کے اندر کچھ پڑا گھاس پر بیٹھے ہوئے ہیں اور صبح سے لے کر شام تک سارا وقت پتے کیلئے میں گزرتا ہے۔ کوئی بیکاری سے گھبرا اٹھا تو باہر جا کھڑا ہوا کہ تھوڑی دیر بم کے گولوں اور بندوقوں کی گولیوں کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھ کر ہی دل ہلائے۔

پہلے تو قلعہ بند فرانسسی وقتاً فوقتاً اپنے اچانک دھاووں سے ہماری پُچسی کا سامان کرتے رہے، مگر بعد چندے انہوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ ادھر اپنی نیمائی مہموں سے ہم خود بھی بہت جلد اکتا گئے۔ آخر خالی میٹھو بیچے یہاں تک نوبت پہنچی کہ قریب تھا ہمارے وحشت کے ہم چھین مارنے لگیں۔ اس وقت میری عمر ۱۹ سال سے زیادہ نہ تھی۔ تندرست، توانا اور پھول کی طرح ترقوازہ تھا۔ اگر کوئی فکر تھی، تو بس اتنی کہ تعلقِ طبع کا رتِ نیا سامان ہوتا رہے، دشمن کے مقابلہ میں یا اور کسی طرح سے۔۔۔ آپ میرے مطلب کو پہنچ گئے ہوں گے۔ چنانچہ ایک اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ کام تو کچھ تھا نہیں، میں نے جو اکیلنا شروع کر دیا۔ چند تباہ کن نقصان اٹھانے کے بعد دفعۃً میری قسمت نے پلٹا کھایا اور صبح ہوتے ہوتے (عموماً ہم رات کے وقت کھیلا کرتے تھے) میں نے ایک کثیر رقم حیت لی۔ تھکن اور نیند میں چور خیمہ سے نکل کر میں کھلے میدان میں گیا اور ایک ٹیلے پر جا بیٹھا۔ میں آپ سے کیا کہوں، کیسا سُہانا اور پُر فضا وقت تھا۔ ہماری قلعہ بندی کے طویل سلسلہ کو کھرنے نظروں سے غائب کر دیا تھا۔ میں نظارہ کرتا رہا، یہاں تک کہ مکان غالب آگئی اور جہاں بیٹھا تھا وہیں اونگنے لگا۔ کسی کے جان بوجھ کر کھنکارنے سے میں چونک پڑا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک یہودی کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ وہ ایک چالیس سالہ ادھیڑ آدمی تھا، خاکی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہنے ہوئے تھا، پاؤں میں سیلبر اور سر پر ہلکی سی سیاہ ٹوپی تھی۔ اس کا نام گریشل تھا اور وہ ہمیشہ ہمارے کپ میں گھومتا رہتا تھا، کسی کو شراب لادی، کسی کو کچھ اور سامان فراہم کر دیا، غرض وہ ہم لوگوں کی ایسی ہی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کر دیتا تھا۔ وہ دُبلّا پتلا، پستہ قد، سُرخ مو اور چھپک رو تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی سُرخ تھیں، اور لگا جھلکتی رہتی تھیں، ناک سُتواں اور خدا رتھی، اور وہ ہم کھانتا رہتا تھا۔ اس نے میرے سامنے جلد جلد پیرے بدن کا اور جھک جھک کر کورنش بجا لانی شروع کی آخر میں نے پوچھا۔

کو، تم کیا چاہتے ہو۔

جی میں۔۔۔ میں صرف اس واسطے آیا ہوں کہ شاید حضور کو مجھے کوئی کام ہو۔

مجھے تم سے کوئی کام نہیں، جاؤ اپنا کام کرو۔

جو حکم، بسر و چشم! میں تو حضور کا، ایک ادنیٰ راجہ آدم ہوں۔ میں نے خیال کیا تھا، شاید کہ

حضور کوئی خدمت ۔ ۔ ۔

ناحق پریشان کرتے ہو جی ۔ ۔ ۔ چلے جاؤ، بس کہدیا۔

واقعی ۔ ۔ حضور ۔ ۔ واقعی ۔ ۔ مگر حضور عالی ۔ ۔ خادم کو ۔ ۔ مبارکباد عرض کرنے کی

اجازت تو ضرور ملنی چاہیے ۔ ۔ ۔

خوب ! یہ تم کو کیسے معلوم ہوا ؟

جی، مجھے معلوم ہے ۔ ۔ اچھی طرح معلوم ہے ۔ ۔ ایک کثیر رقم ۔ ۔ بہت کثیر ۔ ۔ جی ہاں بہت ہی کثیر !
یہ مکمل گزیشل نے ہاتھ پھیلا دیئے اور گردن منکھانے لگا۔

مگر خالی خولی باتوں سے فائدہ ؟ میں نے جھنجھلا کے کہا، ایسی منخوس جگہ، بھلا روپیہ کس کام آسکتا ہے؟

جی واہ ! ۔ ۔ ۔ ایسا نہ فرمائیے حضور ! ۔ ۔ روپیہ بڑی چیز ہے، ہمیشہ کار آمد ۔ ۔ ۔ روپیہ سے آپ جو چیز

چاہیں پیدا کر سکتے ہیں ۔ ۔ حضور جو چیز چاہیں ۔ ۔ بس حکم کی دیر ہے، اور آپ کا خاتم، دیکھئے، ہر چیز پیدا کر دیگا۔

حضور، ہر چیز ! ہر چیز !

ابے جا، کیوں باتیں بناتا ہے۔

یہودی اپنی زلفوں کو جھٹک کر بولا، 'وائے، وائے ! حضور کو میرا یقین نہیں آتا ۔ ۔ ۔ وائے لے وائے !

پھر آنکھیں بند کر لیں اور سر دھنے لگا۔

آہا ۔ ۔ میں پاگیا، حضور کا دل کیا چاہتا ہے، میں پاگیا ۔ ۔ جی ہاں، پاگیا۔ یہودی نے اب بالکل ایسے تود

اختیار کر لئے گویا وہ میرا محرم راز ہے۔

واقعی !

پھر اس نے چوکتا ہو کر اپنے ارد گرد نظر ڈالی اور میری طرف کو جھکا۔

اے حضور ! ایسی پیاری صورت ہے کہ میں آپ سے کیا کہوں، بہت ہی پیاری ۔ ۔ گزیشل نے پھر آنکھیں

بند کر لیں اور ہونٹ چبانے لگا۔

حضور، بس حکم کی دیر ہے ۔ ۔ آپ خود دیکھ لیں گے ۔ ۔ یاد رکھئے میں کیا کہتا ہوں ۔ ۔ مگر آپ کو یقین ہی

نہیں آتا اچھا تو لا کر نہ دکھا دوں بات تو جھبی ہی۔

میں چپ چاپ اس کا منہ میٹھا رہا۔

بس تو یہی ٹھیک ہی۔ ہاں یہی ٹھیک ہی۔ میں لا کے دکھا دیتا ہوں۔

یہ کمکر گر شیل ہنسا اور آہستہ آہستہ میری پیٹھ پھکی مگر پھر فوراً ہی زقند بھر کر دوڑ جا کھڑا ہوا، گویا اس پر کسی نے کھولتا ہوا پانی ڈال دیا ہی۔

مگر حضور کچھ تھوڑا سا پیشگی نہیں دلوایے گا؟

مگر تم مجھے حکم تو نہ دو گے؟ کہیں اور اُدھر سے کسی ٹکٹی چڑیل کو لا کے سامنے کھڑا کر دو۔

اجی واہ، آپ کیا فرماتے ہیں، حضور؟ یہودی نے ہاتھوں کو جھٹک کر غیر معمولی جوش کے ساتھ کہا۔ یہ آپ نے کیوں کر؟ واہ، وا! اگر میں ایسا کروں تو آپ حکم دیجیے، حضور کہ پانسو جی ہاں، پوسے پانسو کوڑے میری پیٹھ پر لگائیں۔ پھر جلدی سے پوچھا تو آپ حکم دیتے ہیں؟

اس وقت میرے ایک ہمدلیف نے اپنے خیمہ کی چاک اٹھائی اور مجھے نام لے کر نچارا۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ایک اشتری یہودی کی طرف پھینک دی۔

یہودی آج رات کو، آج رات کو، بڑبڑاتا ہوا پیچھے رہ گیا۔

رات کب ہوتی ہے، دوستو! میں آپ اقرار کرتا ہوں اس انتظار میں میرا دل بہت ہی بے قرار رہا۔ اسی روز اتفاق سے فرانسیسیوں نے چھاپا مارا اور ہماری رجمنٹ ان کے مقابلہ پر بھیجی گئی، ریشام ہوئی۔ لوگ جا بجا آگ لگے گرو میٹھے تھے۔ سپاہی کھانا پکا رہے تھے۔ میں بھی ایک جگہ لبادہ بچھا کر لیٹ گیا۔ چار پی۔ دوستوں کے قصے کمانیاں سننا اور ہنکارے بھرتا رہا۔ تاش کیلئے کی تجویز ہوئی، میں نے حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سب افسر اپنے خیموں میں چلے گئے، آگ بجھنے لگی۔ سپاہی تیر بھڑ ہو گئے یا دہیں لہی تان کر سو گئے۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ میں نے اٹھنے کا نام نہ لیا۔ میرا رولی مٹھا آگ تاپ رہا تھا اور اونگتا جاتا تھا۔ میں نے اسے بھی پروا نہ دی۔ دیکھتے دیکھتے سارے رکپ میں نانا ہو گیا۔ میں اب بھی دین لیٹا تھا گویا کسی کا منتظر ہوں۔ رات بہت اچلی تھی تارے جھللا رہے تھے۔ بڑی دیر تک میں شعلوں کو دم توڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آخری شعلہ بھی گل ہو گیا۔ لمون یہودی

تو نے خوب چمک دیا! اس خیال سے دل میں سچ و تاب کھا کریں اُٹھنے والا ہی تھا کہ قریب سے اے حضور! کی کاہنتی ہوئی آواز میرے کان میں آئی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو گریشیل۔ اس کا منہ بالکل فق تھا۔ زبان لکنت کرتی تھی۔ آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

آئیے حضور! آپ کے خیمے میں چلیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پیچھے چلا۔ یہودی دہکتا سکر تا نرم نرم گیلی گھاس پر پھونک پھونک کر قدم دھر رہا تھا کہ یکایک مجھے ایک شکل نظر آئی جو بُرے میں لپٹی ہوئی بے حس و حرکت ایک طرف کو کھڑی تھی۔ یہودی نے اُسے اشارہ سے بلایا۔ ۔ ۔ وہ اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس نے کچھ اس کے کان میں کہا، میری طرف پھرا کئی بار سر ہلایا اور ہم تینوں خیمے میں داخل ہوئے۔ آپ سن کر ہنسیں گے، میری اوپر کی سانس اوپر تھی اور نیچے کی نیچے۔ یہودی دبی زبان سے اٹک اٹک کر کہنے لگا، حضور! آپ دیکھتے ہیں۔ ۔ ۔ آپ دیکھتے ہیں اس وقت یہ کچھ ڈرگئی ہے، حضور! ڈرگئی۔ حالاں کہ میں نے اس کو سمجھا دیا ہے کہ حضور والا بہت عمدہ افسر ہیں اور بڑے ہی شریف آدمی ہیں۔ ۔ ۔ ڈرومت ۔ ۔ ڈرومت ۔ ۔ مگر کہا، ڈرومت۔

بُرقہ پوش شکل بت کی طرح ساکت و صامت تھی۔ میں بھی بے طح سٹ پٹایا ہوا تھا اور کوئی بات نہ سوچتی تھی۔ ادھر گریشیل کی بے قراری کا یہ حال تھا کہ ایک جگہ نچلا کھڑا نہ ہوتا تھا اور عجیب عجیب اشارے کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا، بس آپ اب باہر جائیے۔

وہ چلا تو گیا مگر معلوم ہوتا تھا، بڑی بیدی سے اس نے میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔

میں بُرقہ پوش شکل کے پاس آیا اور نقاب اس کے چہرہ سے اٹھ دیا۔

قلعہ کے اندر آگ بھڑکی اتنے فاصلہ پر اس کی جو کچھ ہلکی سی سنہری جوت پہنچ سکی، اس میں مجھے ایک نوجوان یہود کا زرد چہرہ نظر آیا۔ اس کی خوبصورتی دیکھ کر میں ذنگ رہ گیا۔ میں اس کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور چپ چاپ اس کی صورت تنکے لگا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں خفیف سی سرسراہٹ پر میں نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ گریشیل خیمے کا کونہ اٹھا کر باطنیا ط تمام اندر جھانک رہا ہے۔ میں نے جھنجھلا کر اشارہ کیا، چلے جاؤ، وہ غائب ہو گیا۔

میں نے جی کڑا کر کے پوچھا، تمہارا کیا نام ہے؟

جواب دیا، سارہ۔

دفعۃً اس کی بڑی بڑی لچھوئی آنکھوں اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار چمکیلے دانتوں کی سفید بجلی کی طرح
میری آنکھوں میں بھڑک گئی۔

میں نے دوپہری گدے گھیٹ لئے اور زمین پر بچھا کر اس سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس نے دو ٹالہ
اتار ڈالا اور بیٹھ گئی۔ وہ کاسک وضع کی چٹ، اونچی جاگٹ پہنے تھی کہ سامنے سے کھلی ہوئی، اور اس میں چاندی
کی نقشیں گول گھنٹیاں لگی تھیں۔ بالوں کے موٹے سیاہ جوڑے کو اس نے اپنے نازک سر کے گرد دو ہراہج دیکر
پیٹ رکھا تھا۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اس نے
تھوڑی سی مزاحمت کی، مگر اتنی جرات نہ تھی کہ مجھے آنکھ ملائی اور اس کی سانس بھی کچھ اکھڑی ہوئی سی تھی۔ میں اس کی
مشرقی سج وچ پر عرشِ عش کر رہا تھا اور ڈرتے ڈرتے اس کی سر دکا پنتی ہوئی آنکھوں کو دوبارہ ہاتھ۔

کیا تمہیں روسی آتی ہے؟

ہاں، تھوڑی سی۔

کیا تم روسیوں کو چاہتی ہو؟

ہاں چاہتی ہوں۔

تو پھر تم مجھے بھی چاہتی ہو؟

ہاں، میں تمہیں چاہتی ہوں۔

اب میں نے ارادہ کیا کہ اُسے بغل میں لیلوں مگر وہ تڑپ کر الگ جا بیٹھی۔

جی نہیں، جی نہیں، معاف فرمائیے۔

اچھا خیر، میری طرف دیکھو تو سہی۔

اس نے اپنی کالی کالی دل میں کھینے والی آنکھیں مجھ سے چاکیں مگر پھر فوراً ہی شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔

میں نے شوقِ تمام اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اس نے کن آنکھوں سے مجھے گھورا اور آہستہ آہستہ ہنسنے لگی۔

یہ کیا ہے؟

اس نے آیتیں سے منہ چھپا لیا اور کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ خیمے کے دروازہ پر گریش نے نمودار ہو کر اس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

اس کی ہنسی موقوف ہو گئی۔

میں نے دانت پس کر کہا۔ چلے جاؤ، تم نے میری جان ضیق میں ڈال دی۔ گریشیل وہیں کھڑا رہا۔ میں نے پیٹی کھول کر مٹی بھرا شرفیاں نکالیں اور اس کے ہاتھ میں رکھ کر باہر دھکیں دیا۔ حضور مجھے بھی سارہ نے کہا۔

میں نے چندا شرفیاں اس کی گود میں بھی ڈال دیں۔ وہ اُن پریوں جھپٹی جیسے تلی۔

اب تو میں ضرور پیار لوں گا۔

نہیں، جی نہیں، حضور، اس نے لجا کر کہا۔

آخر تم کیوں ڈرتی ہو؟

جی ہاں، میں ڈرتی ہوں۔

یہ کیا واہیات ہی؟

جی نہیں۔

وہ مجھے سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی، سر کو ایک طرف جھکا لیا اور انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر ایک انگڑائی لی۔

پھر تھوڑے سے سکوت کے بعد بولی، اگر آپ چاہتے ہیں تو۔۔۔ یہ یہ لیجئے۔

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے اُسے بوسہ تو دیا مگر زیادہ شوق سے نہیں۔

سادہ پھر ہنسنے لگی۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ مجھے اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں، واقعی میں نے

اپنے دل میں کہا کہ میں بھی کیسا اُلٹو ہوں۔

میں پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

سارہ، سنو، میں تم پر دل و جان سے عاشق ہوں۔

میں جانتی ہوں۔

تم جانتی ہو؟ اور تم خاتونیں ہو؟ کیا تم بھی مجھے چاہتی ہو؟

سارہ نے سر ہلایا۔

میں نے کہا، نہیں، صاف صاف جواب دو۔

اچھا تو آپ مجھے اپنی صورت دکھائیے۔

میں اس کی طرف جھک گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیئے اور میرے چہرہ کو غور سے

دیکھنے لگی۔ تیوری پڑھائی، مسکرائی، مجھے اپنے نفس پر قابو نہ رہا اور بے اختیار ہو کر اس کا منہ چوم لیا۔ وہ اچھل پڑی اور ایک پھلانگ میں دروازہ پر جا کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا، لے آؤ بھی، کیسی شرمیلی ہو۔

اس نے میری بات کا جواب نہ دیا اور وہیں کھڑی رہی۔

میں نے پھر بلایا کہ آؤ یہاں آکر بیٹھو۔

بولی، نہیں حضور، اب نصرت، پھر کسی وقت سی۔

گرشیل نے پھر جھانک کر دیکھا۔ دو ایک کلمے اس کے کان میں کہے۔ وہ خم ہوئی اور سانپ کی طرح ٹلک گئی۔

میں خیمے سے نکل کر اس کے تعاقب میں چلا، مگر نہ تو اسی کی پرچھائیں ملی اور نہ گرشیل کی رات بھر میری

پلک سے پلک نہیں جھپکی۔

دوسری رات کو ہم کتان کے خیمے میں بیٹھے تھے۔ میں پتے کیسں رہا تھا مگر طبیعت اُچاٹ تھی۔ اتنے میں

ارولی نے حاضر ہو کر کہا۔

حضور، کوئی شخص آپ سے ملنے آیا ہے۔

کون؟

ایک یہودی۔

مجھے تعجب ہوا، گریشل تو نہیں ہی۔ میں نے بازی ختم ہونے تک کیسل جاری رکھا۔ پھر اٹھ کر باہر آیا۔
میرا خیال صحیح نکلا۔ گریشل ہی تھا۔ کیا ڈھیٹ تھا، چھوٹے ہی پوچھا
ہاں تو فرمایے حضور! آپ کا دل خوش ہوا؟
ارے تجھ پر خدا کی! اس وقت کرنل نے اپنے ارد گرد دیکھ کر کہا، (یقیناً یہاں کوئی لیڈی تو
موجود نہیں ہے۔ .. اچھا تو مضائقہ نہیں! الفصد!)
ہاں، تجھے خدا سمجھے۔ میں نے کہا، تو آپ مجھے دل لگی کر رہے ہیں۔

کیوں جی؟

یہ کیسے؟

یہ کیسے! کیا اچھا سوال ہے!

جی، جی، آپ بڑے خراب آدمی ہیں! حضور! لڑکی ٹھیری کم سن اور شرمیلی آپ نے اس کو ڈرایا
بیشک ڈرایا۔ گریشل نے طنز یہ کہا مگر ساتھ ہی مسکراتا بھی جاتا تھا۔

نرالی شرم ہے! اچھا تو اس نے روپیہ کیوں لیا؟

تو پھر کیا ہوا؟ کوئی روپیہ دیتا ہو تو کیوں نہ لیں؟

گریشل سنو، اسے پھر لاؤ، ورنہ میں تم سے دست بردار نہ ہوں گا۔ مگر اتنی مہربانی کرو کہ اسے یہاں چھوڑ کر
تم اُلٹے پاؤں چلے جاؤ اور وہیں تھوڑی دیر چین سے بیٹھنے دو۔ سنتے ہو؟
گریشل کی آنکھوں سے چنگاریاں اُڑنے لگیں۔
یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ کو اس سے محبت ہے؟

ہاں، ہے۔

کیا پیاری صورت ہے! ایسی اور کیس نہ ہوگی۔ فرمائیے، مجھے اس وقت کچھ دلوائیے گا؟
ہاں، مگر اتنا خیال رہے کہ راست بازی کے سامنے روپیہ کوئی چیز نہیں۔ اس کو لاؤ اور تم یہاں سے
کالا منہ نہ کرو۔ میں آپ اُسے مکان پہنچا آؤں گا۔

یہودی نے چھوٹے ہی جواب دیا، جی نہیں، صاحب، یہ نہیں ہو سکتا، ناممکن، بالکل ناممکن۔ میں حضور خیمے کے آس پاس ہی ٹھکتا رہوں گا اور ایسا ہی ہے تو خیر۔۔۔ تھوڑی دیر کے لئے چلا جاؤں گا۔۔۔ میں تو حضور کی خوشی چاہتا ہوں۔۔۔ میں ہٹ جاؤں گا۔۔۔ یقین مانئے ہٹ جاؤں گا۔

ہاں ضرور ہٹ جانا اور اس کو لانا، سنتے ہو۔

کیوں نہ ہو، حضور وہ ہی بھی حسین، جی ہاں حسین، کیسی حسین! اگر شیل جھک پڑا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔

ہاں وہ طرح دار ہے۔

تو اس بات پر ایک اشرفی اور عنایت ہو۔

میں نے ایک اور اشرفی اس کی طرف پھینک دی اور ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

دن جوں توں کر کے تمام ہوا۔ رات آئی۔ میں بہت دیر تک اپنے خیمے میں اکیلا بیٹھا رہا۔ باہر اندھیرا گھپ تھا۔ شہر کے گھڑیاں نے دہجائے۔ قریب تھا کہ میں یہودی پر لعنت بھیجنا شروع کروں کہ دفعۃً سارہ اندر آئی۔ تنہا میں اچھل پڑا۔ اس کو اپنے آغوش میں لے لیا اور منہ پر منہ رکھ دیا۔ اس کا جسم مثل برف کے ٹھنڈا تھا۔ مجھے اس کی صورت اچھی طرح نظر نہ آتی تھی۔ میں نے اس کو نیچے بٹھایا۔ سامنے جھک کر اس کے منہ کے قریب اپنا منہ لے گیا۔ اس کے ہاتھ تھام لئے۔ اس کی کمر سلائی۔ اس نے کچھ بات کی نہ ہاتھ پاؤں ہلائے مگر ایک بار کی بلند آواز سے سکیاں بھرنے لگی۔ میں نے دلاسا دیا، منت کی مگر کچھ اثر نہ ہوا، وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رزنے لگی۔ میں نے اس کو گلے سے لگا لیا، اس کے آنسو پاک کئے۔ پہلے کی طرح اس نے مزاحمت نہیں کی، نہ میری باتوں کا جواب دیا مگر زار زار برنو بار کی طرح روتی رہی۔ میرے دل میں ایک میس سی اُٹھی اور اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

گرشیل زمین سے سر نکالتا ہوا نظر آیا۔ میں نے کہا۔

گرشیل، لویہ زرمو عودا حاضر ہے، سارہ کو لے جاؤ۔

یہودی فی الفور طرارہ بھر کر اس کے پاس گیا، وہ رونا دھونا موقوف کر کے اس سے چمٹ گئی۔

خدا حافظ سارہ، میں نے کہا، خدا تم کو اچھا رکھے، الوداع، زندگی بڑی تو پھر کسی وقت ملیں گے۔

گریش خاموش تھا، اُس نے مجھے جھک کر سلام کیا۔ سارہ نے بھی سر کو خم کیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہونٹوں سے لگایا۔ میں نے منہ پھیر لیا۔

دوستو! پانچ چھ دن تک میری یودن مجھے یاد آتی رہی۔ گریش میرے پاس نہیں آیا، نہ مکپ ہی میں کسی کو دکھائی دیا۔ رات کو مجھے اچھی طرح نیند نہ آتی تھی؛ کسی کی آبدیدہ کالی آنکھیں اور گھنی لمبی پلکیں میری نگاہوں میں پھرتی رہتی تھیں۔ میرے ہونٹ اس کے سبب جیسے پکڑے ہوئے اور تروتازہ گالوں کی لذت نہ بھولتے تھے۔ کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں تھا، وہاں ایک ہم کے ہمراہ فراہمی رسد کے لئے مجھے بھیجا گیا۔

میرے سپاہی گھروں میں گھس کر سامان ٹوٹے میں مشغول تھے۔ میں بازار میں ٹھہر گیا تھا اور گھوڑے ہی پر سوار تھا۔ دفعۃً کسی نے میری رکاب پکڑ لی۔

سارہ! تم کہاں؟

اس کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور گھبرائی ہوئی تھی۔

حضور! ہماری داد کو پہنچے، ہمیں بچائیے، آپ کے سپاہی ہماری توہین کر رہے ہیں، حضور...
اب اس نے مجھے پہچانا۔ اس کے چہرہ پر ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی۔

کیا خوب! تم یہاں رہتی ہو؟

ہاں!

کہاں؟

سارہ نے ایک چھوٹے سے کُنڈ مکان کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس طرف کو بگٹٹ اُڑنے لگا۔ مکان کی تنگ انحنائی میں ایک بدقوارہ فروت یودن میرے قدموں پر سار جٹ سلپاں کا کے ہاتھوں سے تین مرغیاں اور ایک بڑا چھینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے مال نیما کو سر سے اونچا کر رکھا تھا اور ہنس رہا تھا۔ مرغیاں قیں قیں اور بڑا ٹاٹاں کر رہی تھی۔ دو اور سوار اپنے گھوڑوں پر گھاس چارہ اُڑاتے کی بوریوں لاد رہے تھے۔ مکان کے اندر سے کسی کے پیچھے کڑوے اور گالیاں دینے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اپنی آدھری لٹکا کر منع کیا کہ یہودیوں سے کوئی تعرض نہ کریں نہ اُن سے کوئی چیز چھینیں۔ سپاہیوں نے تعمیل کی سار جٹ

اپنی مادیان پر سوار ہو گیا اور میرے پیچھے پیچھے چلا۔ میں نے سارہ سے پوچھا۔

کو، تم مجھے راضی ہوئیں؟

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے لگی۔

تم اتنے دن کہاں رہیں؟

آنکھیں نیچی کر کے بولی۔ میں کل آپ کے پاس آؤں گی۔

رات کو؟

جی نہیں، صبح کو۔

یاد کر کے، کیس دھوکہ دو۔

نہیں، نہیں دھوکہ نہ دوں گی۔

میں اُسے پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ ادبھی حسین معلوم ہوتی تھی۔ مجھ اب تک

یاد ہے، اس کے چہرہ کا پختہ کمر بانی رنگ اور اس کی کالی کالی لٹوں میں نیلگوں دھاریاں میرے دل میں کبھی جاتی

تھیں۔ میں نے زمین پر سے جھک کر اس کے نازک ہاتھوں کو بڑی گرجوشی سے دبایا۔

خدا حافظ، سارہ! خبردار، ضرور آنا۔

اچھا۔

وہ چلی گئی۔ میں نے سارجنٹ کو سواروں سمیت پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور گھوڑے کی باگ

اٹھائی۔

دوسرے دن میں بہت سویرے اٹھا۔ وردی پہنی اور خیمہ کے باہر آیا۔ صبح کا پُر نضا وقت تھا۔ سورج

ابھی نکلا تھا اور گھاس کی ایک ایک پتی شبنم اور شفق کی سنہری روشنی میں چمک رہی تھی۔ میں ایک بندہ دمے پر چڑھ کر

ایک سنگ انداز کے کنارہ پر بیٹھ گیا۔ میرے پاؤں میں ایک بھاری بھر کم آہنی توپ اپنی بھیانک گردن کھلے

میدان کی طرف نکالے ہوئے جھانک رہی تھی۔ میں خالی الذہن بیٹھا ہوا ادھر اُدھر نظر دوڑا رہا تھا۔ یکایک کوئی

مقدم کے فاصلہ پر مجھے ایک کمرخمیدہ شخص دکھائی دیا جو خاکِ لبادہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ بہت دیر تک ایک ہی جگہ

چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر دفعۃً ایک سمت کو متوڑی دُور تک دوڑا چلا گیا اور تیز تیز چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔

ایک گھنٹا تک کربٹھ گیا۔ گردن بلند کر کے ہوشیاری کے ساتھ چاروں طرف دیکھا کان لگا کے سنائیں اس کی حرکات کو بہت صفائی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بغل میں ڈال کر ایک کاغذ کا پرزہ اور پنسل نکالی اور اُس پر کچھ لکھنے یا لکیریں کھینچنے لگا۔ اس کا ہاتھ بار بار رُک جاتا تھا۔ خرگوش کی طرح چونکنا ہو جاتا تھا۔ اپنا درگد کی ہر شے کا بہت اتمعق کے ساتھ معائنہ کرتا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہمارے کمپ کا خاکہ اُنارہا ہی کئی مرتبہ اس نے کاغذ کو چھپا چھپا لیا۔ آنکھیں آدمی بند کیں آدمی کھلی رکھیں۔ ہوا کی بوسونگلی اور پھر اپنے کام میں مجھو گیا۔ آخر کار یہودی گھاس پر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ایک پاؤں سے سلیپنگ لکالی اور وہ پرچہ کاغذ کا اس کے اندر ٹھونس گیا مگر ابھی سنبھل کر کھڑا نہ ہونے پایا تھا کہ دفعۃً اس سے دس قدم کے فاصلہ پر ایک پشتے کی آڑ سے میرے سارجنٹ سلیا نکلا کالمی مچھوں والا چہرہ نمودار ہوا اور رفتہ رفتہ اس کا بھدا جسم پورے کا پورا گویا زمین کے نیچے سے نکل آیا۔ یہودی اس کی طرف پیٹھ کے کھڑ تھا۔ سلیا نکلا ایک آن میں اس کے قریب آہونچا اور اپنا بھاری منجہ اس کی گردن پر جمادیا۔ گریشیل معلوم ہوتا کہ سکرکر آدھا رہ گیا یا اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ چوب خشک کی طرح کانپ رہا تھا اور خرگوش کی سی خفیف چخیں اس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ اب سلیا نکالنے اس کا گریباں پکڑ لیا اور دھمکا دھمکا کر خطاب کرنے لگا۔ میں اُن کی گفتگو تو نہیں سن سکا مگر یہودی کے یاوسانہ اشاروں اور عاجزانہ تیوروں سے میں کچھ کچھ تاڈ گیا کہ صورت حال کیا ہے۔

یہودی دوبار سارجنٹ کے پاؤں پر گرا۔ جب میں ہاتھ ڈال کر ایک فرسودہ سا رومال نکالا۔ گرہ کمولی اور اشرفیاں نکال کر سلیا نکلا کو نذر دیں۔ سلیا نکالنے اس پیشکش کو بہت وقار کے ساتھ قبول کیا، مگر اس کا گریبان نہ چھوڑا اور اُسے برابر اپنی طرف گھسٹا رہا۔ گریشیل نے یکبارگی ایک جست لگائی اور چھڑا کر بھاگا۔ سارجنٹ بھی تعاقب میں جھپٹا۔ یہودی خوب تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ بھاگتے میں اس کی نیلی جڑا میں واقعی بڑی پھرتی کے ساتھ چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں مگر سلیا نکالنے متوڑی دوڑا کر اسے پکڑ لیا اور گود میں اٹھا کر یہودی کا کپ کا رخ کیا۔ میں دمدمے سے اتر کر اس سے ملنے کو چلا۔ سلیا نکال مجھے دیکھتے ہی چلا آیا، آہا، حضور! میں ایک جاسوس کو آپ کی

خدمت میں لا رہا ہوں، جاسوس کو۔۔۔ گراڈیل روسی پسینے میں شرابور رہا تھا۔

یہودی بچے، باز آ، کیوں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔۔۔ ٹھہر تو سی۔۔۔ ملعون۔۔۔ خبردار ہو جا،
نیں تو ٹینٹو ادا دوں گا۔

بد قسمت گریٹل اپنی کمیناں سلینا فکا کی پلیوں میں چھبے دیتا تھا اور سیم لائیں چلا رہا تھا اور اس کی
آنکھوں کی پتلیاں جلد جلد گردش کر رہی تھیں۔
کیا قصہ ہے؟ میں نے سلینا فکا سے پوچھا۔

حضور زحمت تو ہو گی، آپ ذرا اس کے دہنے پاؤں سے سلیر اتار لیں۔ میرا ہاتھ وہاں تک
نیں پہنچتا۔

وہ ابھی تک یہودی کو گود میں اٹھائے ہوئے تھا۔ میں نے سلیر اتاری اور اس کے اندر سے احتیاط
کے ساتھ لپٹا ہوا کاغذ نکالا، کھولا، اس پر صحیح صحیح نقشہ ہمارے کمپ کا کھچا ہوا تھا۔ حاشیہ پر چند نوٹ درج تھے
جو یہودی نے اپنی زبان میں بہت باریک بکھر رکھے تھے۔ اس اثنا میں سلینا فکا نے گریٹل کو زمین پر کھڑا کر دیا۔
یہودی نے آنکھیں کھولیں مجھے دیکھا اور میرے پاؤں پر گر پڑا۔
کچھ کے بغیر میں نے اسے کاغذ دکھایا۔

یہ کیا چیز ہے؟

جی یہ کچھ بھی نہیں حضور۔۔۔ میں تو صرف۔۔۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

کیا تم جاسوس ہو؟

وہ میرا مطلب نہیں سمجھا۔ ان پٹناپ بک رہا تھا اور میرے پاؤں کو دباتا جاتا تھا۔

تم جاسوس ہو؟

اس پر غشی کی حالت طاری تھی۔ اس نے سر ہلایا اور چیخ کر بولا، میں!۔۔۔ ہرگز نہیں۔ کیسے ہو سکتا

ہے، ناممکن۔ سراسر محال۔ پھر دبی زبان سے کہا، میں تیار ہوں۔ فوراً اسی دم۔۔۔ میرے پاس روپیہ موجود
نہیں۔ ابھی دیتا ہوں۔ یہ لکمر آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی سیاہ ٹوپی پھسل کر گردن پر ڈھلک گئی تھی۔ اس کے سفید بالوں کی لٹیں بکھری ہوئی تھیں اور اوران سے پینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اور پھر ٹک رہے تھے۔ اس کی بھونچکھی گئی تھیں اور پھر اتر گیا تھا۔ سپاہی ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ میں نے شروع میں یہ خیال کیا تھا کہ گرشیل کو قرار واقعی سرزنش کر کے چھوڑ دوں اور سیلفکا سے کمروں کے خاموشی ہی، مگر اب معاملہ غار ہو گیا تھا اور حکام کے علم میں لائے بغیر چارہ نہ تھا۔

میں نے سارجنٹ سے کہا کہ اسے جرنیل صاحب کے پاس لیجاؤ۔

حضور، حضور، یہودی مایوس ہو کر چلانے لگا۔ حضور، میں بے گناہ ہوں۔ اس سے فرمائیے کہ مجھے چھوڑ دے، حضور، فرمائیے۔

سلیانکائے کہا، چلو آؤ، حضور جرنیل بہادر اس کا فیصلہ کریں گے۔

یہودی میری طرف مڑ کے چلایا، حضور، فرما دیجئے اس سے، رحم کیجئے۔ اس کی چنچوں سے میرے دل پر چوٹ سی لگتی تھی۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ ہمارا جرنیل ایک جرمن نژاد، متدین اور زندہ دل افسر تھا، مگر قانون جنگ کی پابندی میں بڑا سخت تھا۔ میں اس چھوٹے سے مکان میں گیا، جو عارضی طور پر اس کے لئے بنایا گیا تھا اور چند الفاظ میں اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ میں تو اعدا جنگ کی سختی سے آگاہ تھا اور اس لئے دوران گفتگو میں جاسوس کا لفظ تک زبان پر نہیں لایا۔ بلکہ تمام سرگزشت اس پیرایہ میں بیان کی گویا بالکل سرسری واقعہ ہو اور کسی توجہ کے قابل نہیں ہی، مگر گرشیل کی شومی قسمت کہ جرنیل نے اولئے فرض کو رحم پر مقدم رکھا۔

وہ مجھے اپنی ٹوٹی پھوٹی روسی زبان میں کہنے لگا، آپ ہو، نوجوان، نا تجربہ کار، آپ کو ابھی جنگی معاملات کا تجربہ کہاں؟ یہ معاملہ جس کی آپ ہم کو رپٹ دیا ہے، اہم ہے، بہت اہم۔ ہاں۔ ہاں وہ شخص کہاں ہے، جو ماخوذ ہوا، وہ یہودی؟ کہاں ہے وہ؟

میں نے باہر کر یہودی کو اندر لیجانے کا حکم دیا۔ وہ لوگ اس شامت زدہ کو ہاتھوں ہاتھ لے گئے۔ بیچارہ مشکل سے کھڑا ہو سکتا تھا۔

جرنیل نے مجھے مخاطب ہو کر پوچھا، ہاں، وہ نقشہ کہاں ہے جو اس شخص کے پاس سے برآمد ہوا؟
میں نے کاغذ اس کے حوالہ کیا۔ جرنیل نے اسے کھول کر الٹا پلٹا۔ اپنی نظر اس پر جمادی، اور ناک
بھوں چڑھا کر بولا۔

یہ نہایت تعجب کی بات ہے۔۔۔ کس نے گرفتار کیا اس کو؟
سلیا فکا نے جھٹ پکار کر کہا، میں نے حضور والا۔

خوب کیا، شاہباش! جناب آپ اپنی صفائی میں کیا کہتے ہو؟

گرنیل نے بھڑائی ہوئی آوازیں جواب دیا، عالی۔۔۔ عالی۔۔۔ جناب۔۔۔ بالکل۔۔۔ عالیجناب
میں بالکل بے قصور ہوں۔۔۔ یہ کارنٹ صاحب تشریف فرما ہیں ان سے دریافت فرمایا جائے۔ میں تو ایک
ایجنٹ ہوں۔۔۔ عالیجناب بالکل بے قصور، جرنیل نے بنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے دبی زبان سے کہا
اس پر حرج کرنی چاہیے۔۔۔ ہاں تو، جناب، آپ کیا اظہار دیتے ہو؟

میں بے قصور ہوں، عالیجناب میں بے قصور ہوں۔

مگر یہ تو خلاف قیاس کے ہے، تم۔۔۔ روسی زبان میں اس کو کیا کہتے ہیں۔۔۔ تم موقع واردات پر
گرفتار کئے گئے ہو۔ عین برسرِ موقع۔

سنئے حضور! میں بے قصور ہوں۔

کیا تم یہ نقشہ کھینچا؟ تم دشمن کا جاسوس ہو؟

گرنیل گھبرا کر چلا یا، نہیں حضور! میں نہیں۔

جرنیل نے سلیا فکا کی طرف دیکھا۔

حضور والا، یہ جھوٹ بکتا ہے، خود کارنٹ صاحب نے اپنے ہاتھ سے نقشہ اس کی سلیپر کے اندر سے

نکالا ہے۔

جرنیل نے مجھے دیکھا۔

ناچار سر کے اشارہ سے میں نے اس کی تصدیق کی۔

جناب من، تو آپ دشمن کا جاسوس ہو۔

حواس باختہ مجرم نے گڑگڑا کر کہا۔ میں نہیں، میں نہیں۔

جرنیل نے پوچھا، پہلے بھی تم اس قسم کا معلومات دشمن کو پہنچایا ہے اقبال کرو۔
میری کیا مجال تھی!

جناب من، آپ ہم کو دھوکہ نہ دو، آپ جاسوس ہو؟

یہودی نے آنکھیں بند کر لیں، سر جھکا لیا اور اپنی عبا کا دامن پھیلادیا۔

تھوڑی دیر سکوت کر کے جرنیل نے واضح الفاظ میں حکم دیا۔

اس کو پھانسی دیدو۔۔۔ ایم فیوڈور شلیکل مان کہاں ہے؟

سپاہی شلیکل مان، جرنیل کے اڈجوٹنٹ کو بلانے کے لئے دوڑے۔ گریشل کا پہرہ نیلگوں ہو گیا ہنہ
کسل گیا، آنکھیں ابل پڑیں۔

اڈجوٹنٹ حاضر ہوا۔ جرنیل نے اسے ضروری ہدایات دیئے۔ منشی آیا اور اپنی مدقوق چیمپ زد صورت
کی جھلکی دکھا کر اُٹے پاؤں چلا گیا۔ دو تین افسروں نے متحسنا نہ نگاہوں سے کمرہ کے اندر جھانک کر دیکھا۔
میں نے حتی الامکان بہت ہی شستہ جرمین میں جرنیل سے عرض کیا، حضور والا، کافی تنبیہ ہو چکی، اب اس کو
رہا فرمادیں گے۔

اس نے روسی زبان میں مجھے جواب دیا، ہم ابھی کہہ رہا تھا، تم جو ان آدمی نا سنجکار ہو اور لہذا براہ مہربانی
تم خاموش رہو، ہم کو مت دق کرو۔

گریشل چیخ مار کر جرنیل کے قدموں میں لوٹنے لگا۔

حضور عالی، رحم! رحم! میں پھر کبھی۔۔۔ حضور، میرے ایک بیوی ہے، ایک بیٹی ہے، حضور، رحم!

رحم!۔۔۔ واقعی حضور، مجھے تصور ہوا۔۔۔ یہ پہلا وقت ہے، حضور، پہلا وقت ہے، یقین فرمائیے۔

تم اور کاغذات تو نہیں پہنچایا ہے

پہلا وقت ہے، حضور، میری بیوی، میرے بچے۔ رحم! رحم!

مگر تم جا سوس ہو۔

میری بیوی، حضور! میرے بچے۔

جرنیل کا دل اس کی فریاد سے کچھ پسچا مگر افسوس کہ راہ گزینہ تھی۔

اس نے دل پر جبر کر کے ایسے انداز میں جب کہ آدمی خلاف مرضی تشدد سے کام لیتا ہی اور اپنے نرم

جذبات کو فرض منصی پہ قربان کر دیتا ہی۔ کہا

قانون کے موافق اس عبرانی کو پھانسی دیدی جائے۔ لگا دو پھانسی۔۔۔ فیوڈور کا پرل، مہربانی

کر کے آپ اس واقعہ کی رپٹ مرتب کرو۔

گرشیل کی حالت اب بالکل ہی غیر ہو گئی۔ بجائے اس معمولی خوف اور وحشت کے جو قوم یہود کا خاصہ ہے

اس کے چہرہ پر وہ کیفیت طاری تھی جو اکثر نزع کے وقت دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ پسندے میں پھنسے ہوئے وحشی

جانور کی طرح تملتا رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی گھٹکی بندھ گئی تھی۔ وہ زمین پر بچھاڑیں کھاتا تھا اور چھاتی

پٹیتا تھا۔ اس کے ایک ہی پاؤں میں سلیمپر تھی، دوسری پنپانے کا کسی کو نیال نہ رہا تھا۔ عبا کے بندوٹ گئے تھے

اور ٹوپی گر پڑی تھی۔ ہم سب کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ جرنیل حکم سن کر خاموش ہوا تو میں نے پھر عرض کیا۔

حضور والا! بس اب معاف کر دیجئے۔

جرنیل نے چھوٹے ہی جواب دیا، ہرگز نہیں، قانون کا پابندی لازم ہے، تاکہ دوسروں کو عبرت ہو سکے

مگر اس کا لہجہ ہمدردی سے خالی نہ تھا۔

ازراہ خدا ترسی۔

بگڑ کر بولا۔ مسٹر کارنٹ، مہربانی کر کے آپ اپنی جگہ پر جائیے اور حکمانہ باہر جانے کا اشارہ کیا۔

میں سلام کر کے کمرہ سے نکل آیا۔ میں کسی خاص جگہ پر تو متعین تھا نہیں، جرنیل کی قیام گاہ سے تھوڑے

فاصلہ پر بٹھ گیا۔

دومنٹ کے بعد گرشیل برآمد ہوا۔ سلیا نکا اور تین سپاہی اس کو تھامے ہوئے تھے۔ یہودی کے حواس

برجائے تھے اور بیچارہ کو پاؤں اٹھانا دو بھر تھا۔

سلیا دکا میرے پاس سے گزر کر کمپ میں گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ میں رسی لئے ہوئے واپس آگیا۔ اس کا چہرہ سخت تھا مگر دل سخت نہ تھا اور اس وقت اس کے تیوروں سے ایک گونہ تاسف و دلسوزی نپک رہی تھی۔

رسی پر نظر پڑتے ہی یہودی کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ خاک پر بیٹھ کر جبرع فزع کرنے لگا۔ سپاہی چپ چاپ اس کو گھیرے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے اُداس تھے اور آنکھیں زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے نزدیک پہنچ کر گیشل کو مخاطب کیا، جو دودھ پیتے بچے کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں دست تاسف ملتا ہوا اپنے خیمے میں چلا آیا۔ ایک گدے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دفعۃً کوئی شخص گھبراہٹ میں دوڑتا ہوا اندر آیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سارہ پر نظر پڑی۔ وہ اپنے آپ میں نہ تھی۔ وہ میرے قریب جھپٹ کر آئی اور میری آستین کھینچ کے بولی، میرے ساتھ چلو، میرے ساتھ چلو، اس کی سانس پھول رہی تھی۔

کہاں؟ کس واسطے؟ ہمیں بیٹھو۔

ابا کے پاس، ابا کے پاس، جلدی، اس کو بچاؤ، اس کو بچاؤ۔

ابا؟ کس کا ابا؟

میرا ابا، اس کو پھانسی دے رہے ہیں۔

ہیں! اگر شیل تمہارا

میرا باپ ہی، میں پھر کسی وقت آپ سے سب کہہ دوں گی۔ خدا کے لئے اٹھئے، اٹھئے، میرے ساتھ چلئے، اس نے یہ چند جملے ہاتھ مل ل کر بڑی یاس کے ساتھ ادا کئے۔

ہم دونوں خیمے سے نکل کر دوڑے۔ کھلے میدان میں ایک اونچے سے درخت کی طرف جاتے ہوئے ہمیں سپاہیوں کا ایک خول نظر آ رہا تھا، سارہ نے کچھ کہے بغیر ان کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے سٹ پٹا کر کہا، ٹھیکو، ہم کہاں دوڑے جا رہے ہیں؟ سپاہی میرا کہا نہ مانیں گے۔

سارہ مجھے اسی طرح کھینچنے لے جا رہی تھی۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ آسمان میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا،

میں نے پھر کہا، سارہ، سنو تو سہی، یہاں دوڑتے پھرنے سے کیا حاصل؟ بہتر یہ ہوگا کہ میں پھر جرنیل کے پاس جاؤں۔ آؤ ہم تم مل کر چلیں۔ شاید اُسے ترس آجائے۔

سارہ ایک دم ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور دیوانوں کی طرح ٹٹکی باندھ کر میرے منہ کو تکیے لگی۔ سارہ خدارا سمجھو، میں کیا کہتا ہوں۔ میں تمہارے باپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا، ہاں جرنیل کو البتہ اختیار ہے۔ آؤ اس کے پاس چلیں۔

سارہ نے روکے کہا، مگر اتنے ہم وہاں پہنچیں وہ اُسے پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، تھوڑی دُور پر منشی کھڑا ہوا تھا، میں نے اُسے پکار کر کہا، آیوان! امر بانی ہوگی، ذرا وہاں تک دوڑتے ہوئے جاؤ اور اُن سے کہو، میں جرنیل ببار کے پاس سفارش کرنے گیا ہوں، تھوڑی دیر تو وقف کرو۔

بہت خوب، آیوان روانہ ہو گیا۔

ہم کو جرنیل کے حضور میں جانے کی اجازت نہیں ملی۔ میں نے بہت کچھ منت سماجت کی، قیاس دلائیں، مگر کوئی تبدیری نہ چلی۔ آخر سارہ نے اپنے بال کھول دئے، سنتریوں کے قدم لئے مگر انھوں نے کسی طرح اند نہ جانے دیا۔

سارہ نے دیوانہ وار ادھر ادھر نظر ڈالی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کپڑا لیا اور بے تحاشا میدان کی طرف دوڑی۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلا۔ ہر شخص ہم کو حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ہم بھاگ بھاگ سپاہیوں کے پاس جا پہنچے۔ وہ حلقہ باندھے کھڑے تھے اور میرے دوستو، ذرا خیال کرنے کی بات ہے، سب کے سب بیچارے مصیبت کے مارے گریشل کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے مجھے غیظ آگیا اور اُن کو ڈانٹ کر منع کیا۔ یہودی نے ہم کو دیکھا اور اپنی بیٹی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور سارہ بیتاب ہو کر اس سے پٹ گئی۔

غریب کو خیال ہوا کہ شاید معافی مل گئی ہے اور میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ میں نے منہ پھیر لیا۔ ہاتھ مل کے چلایا۔ حضور مجھے معافی ملی، میں نے کچھ جواب نہ دیا۔

نہیں ؟

نہیں ۔

بسور کر کہنے لگا، دیکھئے حضورؑ اسے دیکھئے، یہ لڑکی ۔۔۔ آپ کو معلوم ہے ۔۔۔ یہ میری بیٹی ہے، میں نے کہا، مجھے معلوم ہی، اور منہ پھیر لیا۔

بولا، حضورؑ میں خیمے سے زیادہ دُور نہیں گیا تھا۔ کسی طسج ۔۔۔ میرا یہ مطلب نہ ۔۔۔ وہ کہتے کہتے رُک گیا اور لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر کے کہا، میں آپ سے بس روپیہ اینٹنا چاہتا تھا حضورؑ میں اقرار کرتا ہوں ۔۔۔ مگر کچھ اور ۔۔۔ میں خاموش تھا۔ گریشل میری نظروں سے بالکل گر گیا اور وہ اس کی شریک کار بھی۔

پھر اُس نے دھیمی آواز سے رُک رُک کر کہا، اب اگر آپ مجھے بچالیں ۔۔۔ میں اُسے حکم دیدونگا۔۔۔ میں ۔۔۔ آپ سچے میرا مطلب ؟ ۔۔۔ ہر بات ۔۔۔ مجھے بالکل عذر نہ ۔۔۔

وہ تھرتھرتھرا کر رہا تھا اور دہننے بائیں دیکھتا جاتا تھا۔ سارہ چپ چاپ بے خودی کے عالم میں اس سے چپٹی ہوئی تھی۔ دفعۃً اڈجوسٹ نے اُگر کہا، کارنٹ صاحب، حضورؑ جرنیل بہادر نے مجھے آپ کو حراست میں لینے کا حکم دیا ہے اور تم ۔۔۔ اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ یہودی کو ۔۔۔ فوراً۔۔۔ سلیمانکا یہودی کو قریب آیا۔ میں نے اڈجوسٹ سے کہا، فیوڈور کا پرچ (اس کے ہمراہ پانچ سپاہی آئے تھے) کم سے کم ان سے لکمیر بچاری لڑکی کو تو یہاں سے الگ کر دو۔

البتہ، ضرور۔

ناشا دل لڑکی اپنے حواس میں نہ تھی۔ گریشل یہودی زبان میں اس سے کچھ سرگوشی کر رہا تھا۔ سپاہیوں نے بشکل تمام سارہ کو باپ کی آغوش سے چھڑایا اور اُٹھا کر لیچلے۔ بیس قدم بھی نہ گئے تھے کہ وہ دفعۃً ان کی گرفت سے تڑپ کر نکل آئی اور گریشل کی طرف دوڑی۔۔۔ سلیمانکا نے اسے روکنا چاہا۔ سارہ نے اس کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا، اس کی آنکھیں جھکنے لگیں، اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اور جرمن زبان میں یوں چنچ پیچنے کے کوسنا شروع کیا :-

تم پر خدا کی مار ہو! تمہارا ستیاناس جائے۔ لعنت ہو تم پر، تمہاری سات پشت پر خدا کی اور خدا کے ولیوں کی، تمہاری نسل قطع ہو جائے، تم قاتلے کر کے مرو۔ تم ایڑیاں رگڑ کے مرو، تم کتے کی موت مرو اللہ ہے، پیر جمو! اللہ ہے، بخود اور! زمین تم کو نکل لے، آسمان تم پر پھٹ پڑے، اس کی گردن پیچھے کو ڈھلک گئی اور وہ تورا کر زمین پر گر پڑی۔ سپاہی اسے اٹھالے گئے۔

سپاہیوں نے گرشل کے ہاتھ باندھ دیئے۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ جس وقت میں سارہ کے ساتھ کب سے دوڑتا ہوا آیا تھا، یہ لوگ یہودی پر کیوں ہنس رہے تھے۔ باوجودیکہ موقع ایسا عبرتناک تھا مگر اس کی حالت نہایت ہی مضحکہ خیز تھی۔ دینا سے، بیوی بچوں سے، عزیز و اقربا سے، جدا ہونے کے قلق میں اس سے کچھ ایسے مضحک اشارے، بھیمانک آوازیں اور عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہو رہی تھیں کہ اس کو دیکھ کر منہنی ضبط کرنا دشوار تھا۔ اگرچہ موقع، عام لوگوں ہی کے لئے ہی نہیں، بلکہ ہم سپاہیوں کے لئے بھی درد انگیز، نہایت ہی درد انگیز تھا۔ کجخت کی جان مارے خوف کے ہونٹوں پر آگئی تھی۔ زبان پر فریاد جاری تھی، ہائے! ہائے! ہائے! ٹھہرو، ارے ٹھہرو۔ مجھے کچھ کناہ ہے، بہت کچھ کناہ ہے۔۔۔ نائب سارجنٹ صاحب، آپ تو مجھے واقف ہیں! میں ایک ایجنٹ ہوں، بے گناہ ایجنٹ۔ مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے؟ ٹھہرو، منٹ بھر ٹھہرو، ارے آدھا منٹ، پاد منٹ، ٹھہرو، جانے دو۔ میں تو غریب یہودی ہوں سارہ ۵۔۔۔ ارے، سارہ کہاں ہے؟ ہاں، مجھے خبر ہے، وہ کوئر لفٹ صاحب کریمے میں ہے (خدا جانے مجھ کو یہ نوساختہ خطاب عطا کرنے سے اس کا کیا مطلب تھا) حضور، کوئر لفٹ صاحب میں خیمے کے پاس موجود ہوں۔

(سپاہی گرشل کو مضبوط پکڑے ہوئے تھے۔۔۔ اس نے زور سے ایک پیچ ماری اور تڑپ کر اُن کے ہاتھوں سے نکل گیا)

حضور عالی، رحم کرو! مصیبت کا مارا ہوں، بال بچوں والا ہوں۔ میں آپ کو دس اشرفیاں دیتا ہوں، پندرہ دیتا ہوں۔۔۔ حضور عالی۔۔۔ سپاہی اُسے درخت کے قریب کھینچ لے گئے۔ چھوڑ دو، رحم کرو، حضور لفٹ صاحب! حضور جبریل صاحب! امید ان صاحب! آخر انہوں

نے اس کی گردن میں پھندا ڈال ہی دیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور وہاں سے بھاگنا۔

میں دو ہفتہ تک زیر حراست رہا۔ مجھے خبر ملی کہ بد نصیب گریٹل کی بیوہ اس کے کپڑے لینے کے

لئے آئی تھی۔ جرنیل نے اُسے سو روپے دلوائے۔ سارہ کو میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ میں لڑائی میں زخمی

ہو گیا اور ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میرے اچھا ہونے کے تاک ہی ڈنرگ نے پھاٹک کھول دیئے

اور میں اپنی رجمنٹ متعینہ رہائش میں جاساں ہوا۔



تبصرہ

اردو کے جدید مطبوعات

ادب

ترجمہ و مولفہ جناب محمد عمر صاحب بی اے و فورا آئی صاحب بی اے قیمت (۸)

فراق شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہوری دروازہ - لاہور

ہم اس سے قبل اس امر کی اطلاع دے چکے ہیں کہ ان دونوں صاحبوں نے یہ تہیہ کیا ہے کہ دنیا کے مشہور اور اعلیٰ ڈراموں کا ترجمہ اردو زبان میں کریں اور یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ وہ بڑے سرعت سے اپنے ارادے کو پورا کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے مدروح سیاست اور ”جانِ ظرافت“ دو ڈرامے شائع ہو چکے ہیں اور اب یہ تیسرا ڈراما ہے۔ یہ جرمن کے نامور فلسفی شاعر اور ڈراما نگار شیلر کے مشہور اور زبردست ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ اسے محض ترجمہ کہنا نا انصافی ہے، یہ ترجمہ اور تالیف دونوں ہیں۔

قابل ترجمہ جن کا شروع سے یہ خیال ہے کہ ان ڈراموں کا کامل ترجمہ زیادہ سودمند نہیں بلکہ اہل ملک کے ذوق اور ملکی ناک کے حالات کے رومے اس میں مناسب تصرف کی ضرورت ہے تاکہ پڑھنے والوں اور ناٹک دیکھنے والوں کی دلچسپی بڑھے اور ایسے حالات اور خیالات کے دیکھنے اور سننے سے الجھن میں نہ پڑیں جن سے وہ مانوس نہیں۔ ایک حد تک تو مجھے اس خیال سے اتفاق ہے یعنی ملکی تھیٹر کی ضروریات کی خاطر صرف جائزہ کیوں کہ بعض اوقات ڈرامے محض پڑھنے کے لئے لکھے جاتے ہیں اور ایسٹج کے لئے ان میں کتبہ بنیت کرنی پڑتی ہے۔ مطالعہ کی حالت بالکل جدا ہے اور جب وہی تھیٹر کے ایسٹج پر آتا ہے تو اس کا رنگ اور ہوتا ہے۔ وہاں اصل زندگی کی ہوبو نقل کرنی پڑتی ہے بلکہ نقل کو اصل کر دکھانا مقصود ہوتا ہے، اور پھر اس کے ساتھ ان شرائط

اور قیود کی پابندی بھی کرنی پڑتی ہے جو تھیٹر کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر قزاق ہی کو لیجئے۔ اصل ڈراما مطالعہ کے لئے بے مثل اور عجیب کتاب ہو اور اسی لئے جرمن زبان میں بھی تھیٹر کی خاطر تصرف کر کے نیا ادیشن تیار کرنا پڑا۔ نور عمر صاحبان (یعنی محمد عمر صاحب و نور آلی صاحب) نے بھی اردو کے دو ادیشن تیار کئے ہیں ایک عام مطالعہ لئے اور دوسرا تھیٹر کے واسطے کیا اچھا ہوتا اگر عام مطالعہ کے لئے تمام محال ڈراما کا ترجمہ کر دیا جاتا۔ کیوں کہ اس میں تمدنی حالات و خصوصیات کی وہ نزاکتیں نہیں ہیں جن کی وجہ سے پڑھنے والے انجمن پیدا ہو۔ اس کا تعلق زمانہ وسطیٰ سے ہے جس کا تمدن ہر جگہ تقریباً یکساں تھا اور اردو خواں طبقہ اُسے بڑے ذوق سے پڑھتا اور مستفید ہوتا۔ تصرف اور ایجاز سے مصنف کے تخیل کی بلند پروازی اس کے پر زور خیالات اور حکیمانہ نکات اور زور قلم کا بہت سا حصہ حذف ہو گیا ہے۔ دوسرا تصرف قابل موفین نے یہ کیا ہے کہ اصل ڈراما ٹریجڈی (المیہ) تھا، انھوں نے اسے کامیڈی (ہزیمہ) کر دیا ہے، لیکن اس تصرف میں انھوں نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔ ان تصرفات سے انھوں نے جرمن ڈراما کو ہندوستانی ناہک بنا دیا ہے۔ میانک کہ نام بھی بدل دیئے ہیں۔

باوجود ان تصرفات کے ان کی یہ کوشش قابل تعریف اور لائق داد ہے۔ اس ڈراما کی زبان پہلے دو ڈراموں کے مقابل میں زیادہ فصیح زیادہ شاندار ہے اور اصل مصنف کے خیالات (جہاں تک اس میں باقی ہیں) اور زور قلم بڑے حسن و خوبی سے ادا کیا ہے۔ یہ ڈراما درحقیقت ایک اخلاقی اور مذہبی ڈراما ہے۔ اور بعض خاص کیرکٹرن پر ڈرامے کا دار و مدار ہے، ان کے خیالات اور دلی جذبات، ان کی کمزوری اور قوت کی تصویر اس حسن و خوبی کے ساتھ کھینچی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ باپ کی محبت اور اس محبت کی کمزوری عجیب مغرب ہے۔ بڑا بیٹا حالات و زمانہ کی نامساعدت اور مایوسی سے گھر کر قزاقوں میں جا ملتا اور ان کا سردار ہو جاتا ہے۔ باپ کو اس کا حال معلوم نہیں مگر چھوٹا بیٹا کمینہ سازشوں اور بدظنیتی سے باپ کو بڑے بھائی سے برگشتہ کر دیتا ہے اور فریب سے اس کی موت کا یقین دلاتا ہے۔ باپ بیٹے کی محبت میں بیقرار ہے، زندگی دو بھر ہے۔ چھوٹا بیٹا اگرچہ اس عیاری سے وارث ہو جاتا ہے مگر جب تک باپ زندہ ہو مال و دولت پر قابض نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ باپ کو حقیقی معنوں میں زندہ در گور کر دیتا ہے۔ یعنی ایک قسم کے چاہ یلمان میں قید رکھتا ہے۔ ابھی مرنے نہیں پاتا کہ قزاق کی وجود حقیقت بڑا

بیٹا ہے) ہاتھوں قید سے مخلصی پاتا ہے لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بیٹے پر انتقام کی کینچل آنے والی ہے تو وہ بے قرار ہو کر تڑپنے لگتا ہے اور نہایت لجاجت سے رحم کی التجا کرتا ہے۔ جب اُس سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایسا نالایق بیٹا۔ رحم کا مستحق نہیں تو وہ کس محبت سے کہتا ہے کہ ”نالایق بیٹا، پھر بھی میرا بیٹا ہے“ فراق اگرچہ بری صحت میں ہے۔ ڈاکوؤں لیٹروں کا سردار ہے مگر اس کے دل میں شرافت کا نور ابھی باقی ہے وہ باوجود اس ناشائستہ صحبت کے مظلوموں کی حمایت کرتا اور ظالموں کو اُن کے اعمال کی منزا دیتا ہے۔ وہ اُس قانون کی جو مظلوموں اور بیکسوں کو کچلے اور دے ڈالتا ہے، علانیہ مخالفت کرتا ہے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر دنیا کی چول ٹھیک ٹھیک بٹھانا چاہتا ہے۔ لیکن فراقی آخر فراقی ہے۔ ایک خاٹی کی سسرال کے لئے بیسیوں بے گناہ مارے جاتے ہیں، ایک مظلوم کے انتقام کے لئے بیسیوں معصوموں کا خون ہو جاتا ہے۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ آخر میں متنبہ ہوتا ہے۔ چھوٹے بھائی کی بدظہنتی، مکینہ سازشیں، بیدردی اور بے رحمی، فراق کی شرافت کو اور نمایاں کر دیتی ہیں۔ بُرائی کو حقیقی رنگ میں دکھانا نیکی کی خدمت ہے۔ جمیلہ (ایملیا) ان کی چچا زاد بہن ہے۔ بیٹے بیٹے یعنی فراق پر عاشق ہے۔ چھوٹا جب امارت حاصل کر لیتا ہے تو یہ اُس کی دست نگر اور محتاج ہو جاتی ہے اور وہ اپنی حکومت اور دباؤ سے چاہتا ہے کہ جمیلہ کو اپنے قبضے میں لے آئے۔ مگر اس کی محبت ایسی سچی اور مستقل ہے کہ وہ اس کی امارت اور حکومت کی مطلق پرواہ نہیں کرتی۔ یہ تمام کیرکیر ایسی خوبی سے بیان کئے گئے ہیں کہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اصل ڈراما نہایت ہی ہولناک ٹریجڈی ہے۔ اُس اڈیشن میں جو تھیلٹر کے لئے تیار کیا گیا تھا، اسے بہت کچھ نرم کر دیا ہے لیکن ہمارے مترجم مولفین نے انجام کو بالکل بدل کر اسے اچھی خاصی کامیڈی (ہزیمہ) بنا دیا ہے۔ آخر میں ان دونوں صاحبوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آئندہ جب دوبارہ طبع کی نوبت آئے تو اس ڈراما کا تمام وکمال ترجمہ اردو میں کر دیں اور میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ اُن کے ترجمہ کی ضرورت قدر ہوگی۔ میرے بار بار اصرار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ دنیا کے بہترین ڈراموں کے کامل اور صحیح ترجمے اہل وطن کے سامنے پیش کئے جائیں تاکہ وہ صحیح طور پر اندازہ کر سکیں کہ ڈراما کسے کہتے ہیں اور ممکن ہے کہ اُن میں جو جو ہر قابل ہیں وہ اپنی زبان میں ویسے یا اُن سے بہتر ڈرامے تصنیف کر سکیں۔ اگر ہم اپنے ترجموں کی بدولت ایک آدمی شخص گجا

ایسا پیدا کر سکیں تو اردو ادب پر کیا کم احسان ہوگا؟ خصوصاً یہ زمانہ ڈرامے کے لئے بہت موزوں ہی ملک میں انقلابی حالت پیدا ہو گئی ہے، خیالات میں ہیجان اور دل و دماغ میں حرکت دکھائی دیتی ہے، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی حالت میں تغیر عظیم پیدا ہو گیا ہے اور جد ہر نگاہ اٹھائے ڈرامے کے لئے اچھا خاصا سامان نظر آتا ہے۔ حالات و واقعات پکارے کہہ رہے ہیں کہ بس ایک جادو نگار قلم اور بلند خیال دماغ کی ضرورت ہے۔

خنجر ہلال۔ یہ ایک تاریخی ڈراما ہے جو منشی غلام قادر صاحب فرخ امرتسری نے ترکوں کے معاملاتِ حال پر لکھا ہے۔ اس میں محاربہ عظیم یورپ کے بعد ٹرکی کی بے بسی، اتحادیوں کی ریشہ و داناںیاں، یونانیوں کی دست برد، ترکوں کی جیسا اور کامیابی کا مرقع کھینچا ہے۔ ڈرامے کے لئے مضمون بہت اچھا ہاتھ آیا ہے، فرخ صاحب مشاق شاعر اور ناثر ہیں۔ چنانچہ اس ڈرامے میں اُن کی نظم و نثر اس کی شاہد ہے۔ اردو میں ڈراما نویسی کا فن نہایت پست حالت میں ہے۔ اس وقت یہ آخری ڈراما ہے جو اُن میں لکھا گیا ہے ترجمہ نہیں، غیر زبان کے کسی ڈرامے سے ماخوذ نہیں، بلکہ فرخ صاحب کی اپنی تصنیف ہے۔ لیکن اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک اردو ادب کے اس شعبہ لطیف نے کوئی ترقی نہیں کی۔ ڈرامے میں اہل چیز کیر کیڑ ہے۔ خاص اشخاص ڈراما کی خصوصیات اس خوبی سے بیان کی جاتی ہیں کہ وہ زندہ اور جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ یہ ڈراما نویس کا خاص بحال ہے کہ جوں جوں ڈراما ترقی کرتا جاتا ہے یہ خصوصیات بھی ساتھ ساتھ نمایاں ہوتی جاتی ہیں چنانچہ بعض مشہور ڈراموں کے کیر کیڑ تاریخی مشابہ سے بھی زیادہ معروف اور مقبول ہیں۔ خنجر ہلال میں یہ بات بالکل مفقود ہے اس کے اشخاص بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ غازی مصطفیٰ بحال جو اس ڈرامے کے خاص کیر کیڑ ہیں وہ بھی بے رنگ نظر آتے ہیں ہم چوں کہ روزانہ اخبارات اور حالات پڑھتے رہتے ہیں اس وجہ سے پہلے سے ہمارے دل میں اُن کی بے انتہا وقعت ہے ورنہ اگر کوئی نیا شخص اس ڈرامے کو پڑھے تو کبھی اس کے دل میں وہ حرمت و وقعت پیدا نہیں ہوتی اس ڈرامے میں بہت اچھا موقع تھا کہ قابل مصنف اُن کے کمالات اور خصوصیات کو رفتہ رفتہ بھارتے اور ترقی دیتے۔ مجھے اس میں بھی شبہ ہے کہ یہ ڈراما بغیر کمی بیشی اور کاٹ چانٹ کے ایسٹج پر بھی کامیاب ہو سکتا ہے نہیں بعض سین غیر دلچسپ اور بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ اس بات کا خیال نہیں رکھا گیا کہ کون سی باتیں ترک کر دینی چاہئیں اور کون سی نمایاں کر کے دکھانی چاہئیں۔ شاعر اور خاص کر ڈراما نویس کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ سب کچھ

دیکھتا ہے مگر اس کی نظر وہی چیز انتخاب کرتی ہے جو سارے معاملے کی جان ہے۔ انھیں وجہ سے میں نے ”قزاق“ کے تبصرے میں اعلیٰ درجے کے ڈراموں کے بے کم و کاست ترجمہ کی ضرورت خیال کی ہے۔

ڈرامے کی شریعت میں دو تصویریں بھی ہیں۔ ایک غازی مصطفیٰ الکمال کی اور دوسرے جس میں غازی موصوف اور اُن کے وزراء حکومت ہیں۔ یہ دونوں تصویریں اس قدر خراب ہیں کہ اگر ہنوتیں تو اچھا ہوتا چھپائی اور کاغذ بھی بہت معمولی ہے۔ قیمت (۷۰) منیر صاحب دارالاشاعت امرت سر سے مل سکتا ہے۔

زندہ جاوید۔ تنظیم سیدہ انیس الفاطمہ بیگم صاحبہ (مسٹر محمود) کی تصنیف ہے جس میں مصنف نے امام حسین کی شہادت کا واقعہ بیان کر کے اُسے موجودہ حالات سے مطابق کیا ہے اور اُسی اشار و صداقت کی ترغیب دی ہے۔ کاش ہمارے مرثیہ گو شاعر ہونے لڑانے کے بجائے اس عظیم الشان اور بے مثل سانچے سے اخلاقی کام لیتے۔ اگرچہ یہ نظم اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے تاہم قابل مصنفہ قابل شکر گزاری ہیں کہ انھوں نے قوم کے ابھارنے کے لئے اپنی شاعری سے ایسا مفید کام لیا۔ شریعت میں آٹھ صفحہ کا ایک مقدمہ بھی ہے اس کتاب کا کل منافع مصیبت زدگان اناطولیہ کے امدادی سرمایہ میں داخل کیا جائے گا۔ گویا اس کا خریدنا اور پڑھنا ایک پنہ دو کاج ہے (چھوٹی تقطیع تعداد صفحات ۳۲ قیمت ۵۰) ذیل کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

سید انیس الفاطمہ بیگم صاحبہ۔ مکان حاجی مولوی علی بخش صاحب مرحوم محلہ مسلح پور ڈاکخانہ مندر و پٹنہ (عظیم آباد) درس عمل۔ یہ مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنؤی کے چند نظموں کا مجموعہ ہے جو دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ اس میں کل دس نظمیں ہیں جن کے عنوان یہ ہیں۔ نواسے درد، نوائے ملت، نالہ غم، سرخس صلائے عمل، فغانِ دل، حامیانِ قوم سے خطاب، فریادِ معصوم (ایک یتیم مولیٰ بچے کی زبان سے) جوانِ ترک، ان ناموں سے نظموں کی کیفیت عیاں ہے۔ یہ سب کی سب نظم کی اُس قسم میں سے ہیں جو ہمارے ہاں قومی کمالات کی ہے۔ محوی صاحب کی نظم و شریعت اہل زبان ناواقف نہیں اور اس لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ کتاب چھوٹی تقطیع پر اچھی چھپی ہے۔ قیمت (۴۰) ہے۔

جوئے شیریں (مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ)

محمود شاہ خاں صاحب بی اے ال ال بی کی فرہاد وار کوشش کا نتیجہ ہے۔ یعنی ایک ہی نظم (اور پھر شریعت)

میں سے الگ الگ چار نظمیں تراشی ہیں جس کا نمونہ ذیل میں درج ہے:-

یاد خدا کی دل سے کر پھیر نہ منہ ادھر ادھر
عمر کر اس طرح بسر جیسے کئی کا ہوسفر
دہر کی ہے ہوا یہی رسم جہاں بھی ہے یہی
جشن میں دل کہیں لگا اور کہیں ہر چشم تر
دستِ قصانے مجھ کو جب رہ روزِ زندگی کیا
مایہ لذتِ منسا دل کے لئے بنی سپر
اگ لگا کے شوق کی کس نے دلِ خراب میں
پھونک دیا کلیم کا ایک ہی آرخ میں جگر
عیش پٹے خاک ڈال کر باہم فلک کی سیر ہو
تج یہ آفوں گری اسے دلِ ناصبور کر
باغِ وفا میں دیکھ آ کر کے تارِ جان و دل
وسعدہ وصل پر نہ جا مان یہ قولِ معتبر
شوخِ نمال آرزو خشک ہو انتظار میں
بادِ سحر کو یہ خبر دے کہیں جلے نامہ بر
عمدِ قلم و الست بھول گیا ہر ایک مست
حیف کہ دل ساراز دار وہ بھی خطا کری اگر
دیکھے یہ ادا نہی دلبر بے نیاز کی
پھول کو خود گرا دیا صحنِ چمن میں توڑ کر

ان دس شعروں میں جن الفاظ پر ہم نے نشان لگنا دیا ہے ان کو جمع کرنے سے پہلی مثنوی کا پہلا

مصرعہ پیدا ہو گا۔ ع

”یاد ہے لذتِ پیمانِ الست“

نشان ۲ کے الفاظ جمع کرنے سے دوسری مثنوی کا پہلا مصرعہ بن جائے گا۔ ع

”وہر میں کی کس نے یہ آفوں گری“

اسی طرح ۳ اور ۲ کے تحت میں جو الفاظ یا جزو الفاظ آئے ہیں ان کو یکجا کرنے سے دوسری مثنوی کا پہلا

(۱) کسی نے مجھ کو کل آ کر خبر دی اور

(۲) لے مایہ عیش جاودانی

اسی طور پر ایک ہی نظم سے چاروں مثنویوں کے مصرعے نکلتے چلے آتے ہیں۔ آگے جا کر نظم کے بجائے شری عبارت آگئی ہے اور پھر ایک دوسری نظم اور شری ہے لیکن وہ چاروں مثنویاں اسی طریق پر مرتب ہوتی چلی جاتی ہیں جس کا نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔

اس دشوار اہتمام سے نظم اور مثنویوں میں کیس کیس بہت تکلف پیدا ہو گیا ہے جس کا خود فاضل مصنف کو اعتراف ہے۔ نیز معنوی اعتبار سے بعض شعر (خاص کر چوتھی مثنوی کے) بالکل خلاف محل اور محض قافیہ پیمائی نظر آتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ جدید اور لطیف صنعت مصنف کی ذہانت و قدرت شعر گوئی کا بہترین ثبوت ہے اور اسی لئے ہمیں ان سے یہ شکایت کرنے کا حق ہے کہ وہ اپنی ان خداداد قوتوں سے کوئی اور مفید کام کیوں نہیں لیتے کہ انہیں اس قسم کی ”سنگ تراشی“ بلکہ کوہ کنی میں صرف کر رہے ہیں جس میں اعجاز بیت کے سوا اور کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔

سفرنامہ

۱۔ مشرقی ترکستان (دارۂ ادبیہ لکھنؤ قیمت ۴)

سراوریل اسٹائن مشہور سیاح وسط ایشیا جب دوسرے سفر سے واپس ہوئے تو انھوں نے رائل جغرافیہ سوسائٹی لندن میں اپنی سیاحت اور تحقیقات کے متعلق ایک لکچر دیا۔ اور اپنے ایران و ہندوستان و افغانان و ترکستان کے اُن دوستوں کے لئے جو انگریزی میں جانتی فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اس فارسی ترجمہ سے سید محمود عظیم فہمی صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا۔ سراوریل کا اصل سیاحت نامہ دو ضخیم جلدوں میں ہے۔ یہ لکچر انھوں نے سنہ ۱۹۰۷ء میں دیا تھا۔ اس کا ترجمہ اب اردو میں چھپا ہے جب کہ تیسرے سیاحت نامے بھی وہ کامیاب اور مالامال ہو واپس آچکے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر اُس تیسری سیاحت کی بھی مختصر سی کیفیت اس کے آخر میں درج کی جاتی۔ وہ اس پر بھی کئی لکچر دے چکے ہیں۔ تاہم اس کے پڑھنے سے معلوم ہو گا کہ یہ پیرچراں بہت یکسے کیسے خطرناک اور دشوار گزار مقامات پر پہنچا ہے جہاں آدمی کا جانا ممکن نہیں معلوم ہوتا اور وہاں سے کس قدر غیر معمولی محنت و مشقت کے بعد آثار قدیمہ کی وہ لازوال دولت لے کر آیا جو صد ہا سال سے انسان کی آنکھوں سے پوشیدہ تھی۔ اس نے قدیم کتابوں اور قدیم صنعتوں اور تحریروں اور عجائبات کے سوا ونٹ لاؤ کر بھیجے اور یہ سب پھریں اُس نے صحرائے بق و وق میں سے کھود کھود کر نکالیں یا ایسے خفیہ مقامات سے ڈھونڈ کر نکالیں جن کا پتہ کسی کو نہ تھا۔ اس شخص کی حیرت انگیز ہمت و استقلال خطرات اور دشواریوں سے صابرانہ مقابلہ

اپنے مقصد کی دھن نہایت قابل تعریف اور سبق آموز ہے۔

۲۔ سیاحت ہوا (دائرہ ادبیہ لکھنؤ۔ قیمت ۷ رو ۸)

”سیاحت زمین“ کے طرز پر یہ دوسرا ناول بھی دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے انگریزی سے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے اور اس میں بھی قصے کے پیرائے میں ہوائی جہازوں کے متعلق بہت کچھ معلومات جمع کی ہیں اور اگرچہ اس اصلی فائدہ یورپ و امریکہ والے ہی اٹھا سکتے ہیں پھر بھی اہل ہند کے لئے ایسی کتابیں دلچسپی سے خالی نہیں لیکن کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل فرانسیسی ناول میں بائیس سال پہلے لکھا گیا تھا اور اسی لئے اس میں فن پرواز کے متعلق بعض ایسے پرانے مباحث پائے جاتے ہیں جنہیں علمی دنیا طے کر چکی اور جنہیں ایسی شد و مد کے ساتھ تازہ کرنے کا اب کوئی موقع نہیں ہے۔

قابل ترجمہ نے کتاب میں کہیں کہیں جغرافی اور تاریخی حواشی لکھنے میں کافی محنت و درد سری اٹھائی ہے لیکن ہمارے خیال میں بہتر ہوتا کہ وہ اتنا وقت خود ترجمے کو زیادہ صاف و سہل بنانے میں صرف کرتے۔ بحالت موجودہ کتاب کی بعض عبارتیں سچیدہ اور ہمارے روزمرہ کے بہت خلاف نظر آتی ہیں اور بعض غیر ضروری مضامین بھی ہمارے ذوق اور معاشرت سے اس قدر بعید و بیگانہ ہیں کہ شاید معمولی اردو خواہاں ان کا کوئی لطف حاصل نہیں کر سکتے۔ بہتر ہوتا کہ انہیں ترجمے سے حذف کر دیا جاتا۔

لغات اردو (جلد اول و دوم۔ مؤلف: خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنؤی۔ قیمت ۱۲ رو ۸)

اردو لغت کے یہ دو رسالے ہیں۔ پہلی جلد میں مصادر مفردہ کے لغوی اصطلاحی معانی اور محاورے ہیں اور دوسرے میں مصادر مرکبہ معاون فعل کے لغوی اصطلاحی معنی اور ان کے استعمال کی مثالیں دیے ہیں۔ یہ رسالے اگرچہ حقیقتاً نہ نہیں ہیں مگر صحت اور احتیاط سے لکھے گئے ہیں اور طلبہ اور عام پڑھنے والوں کے لئے جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں بہت مفید ہیں۔ ہمیں دیباچے میں یہ پڑھ کر بہت ہی افسوس اور رنج ہوا کہ خواجہ صاحب نے دوبارہ اردو زبان کی کامل لغت تیار کی اور دونوں بار مسودے تلف ہو گئے۔ ایک مسودہ تو طغیانی کے تذر ہوا اور دوسرا ایک سرپرست کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔ اب یہ تیسری بار ہے۔ اور اس وجہ سے انھوں نے لغت کو چھوٹے چھوٹے رسالوں میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ مصاو

مفردہ اور مصدر مرکبہ کو الگ الگ دو رسالوں میں کیوں شائع کیا۔ مفرد مصدر کے ساتھ مرکب مصدر بھی آسکتے تھے اور ایک جگہ ہونے سے ناظرین کو آسانی ہوتی۔ اب یہ بڑی دقت ہے کہ مفرد تو ایک جلد میں ہیں اور مرکب دوسری جلد میں اور تیسری جلد میں مصدر مرکب کی قسم دوم کا بیان ہوگا، گویا ایک مشکل اور بڑھ جائے گی۔ خواجہ صاحب کو مغالطہ ہوا ہی۔ وہ دیا پچے میں فرماتے ہیں ”مصدر کے معانی لکھنے میں اہل لغت نے یہ فرق کر دیا ہے کہ مصدر مفرد اور مصدر مرکب کے ایک ہی معنی سمجھ کر مفرد مصدر کے معنی کی مثال مصدر مرکب سے پیش کی ہے جن میں درحقیقت زمین آسمان کا فرق ہے۔ لغت دیکھنے والے فائدے کے بدلے نقصان اٹھاتے ہیں اور یہ تقلید بھی انگریزی زبان کی ہے“ اول تو یہ انگریزی کی تقلید نہیں، دوسرے اگر کسی نے ایسا کیا ہے کہ باوجود فروق معانی کے ایک ہی معنی لکھ دیئے ہیں تو غلطی کی، آپ اس کی تقلید نہ کریں۔ مگر اس سے مصادر کی تین الگ الگ جلدیں لکھنے کا جواز نہیں نکلتا۔ اگر دوسرے لغت نویسوں نے اس معاملے میں تفریط کی ہے تو خواجہ صاحب نے بھی افراط سے کام لیا ہے۔ مثلاً تا پا کرنے کے معنی سیکھتے رہنا۔ اس کے لکھنے سے کیا حاصل۔ ایسے بیسیوں مصادر ہیں جن کے ساتھ کرنا استمراری معنی دیتا ہے۔ مثلاً پیا کرنا، لکھا کرنا پڑھا کرنا وغیرہ وغیرہ صرف دیا پچے میں یہ بتا دینا کافی ہے کہ کرنا جب امدادی فعل ہوتا ہے تو اس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں اگر اس کے خلاف کوئی نئے معنی پیدا ہوں تو لکھنا لازم ہے۔ تا پا کرنے کے نیچے تانا کرنا ہے اس کے معنی داغنا، طعنہ دینا لکھا ہے۔ لیکن تاننا کے معنی بھی تو یہی ہیں۔ فرق کیا ہوا۔ غالباً یہاں لکھنے میں سہو ہوا ہی۔ کیوں کہ مثال سے صحیح معنی معلوم ہو گئے ہیں۔ اسی طرح جانا، ہونا، لگنا وغیرہ متعدد امدادی فعل ایسے ہیں کہ جب دوسرے مصادر کے ساتھ آتے ہیں تو معنی میں ایک خاص بات پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کا بتا دینا کافی ہے۔ اب ہر مصدر کے ساتھ بلا وجہ ان افعال کو لگا کر تعداد بڑھانا فضول ہے۔ بھلا فرمانے لگنا بھی کوئی محاورہ ہے جو لغت میں لکھنے کے قابل ہے۔ مگر خواجہ صاحب نے یہ اور ایسے بہت سے مصادر مرکبہ (معاون فعل) درج لغت فرمائے ہیں۔ جب تک خاص معنی پیدا نہ ہوں ان کا لغت میں لکھنا غیر ضروری ہے۔ اس پر بھی جدید جلد قائم کرنے کی ضرورت ثابت نہیں ہوتی۔

پا جانا کے معنی صرف ملنا لکھے ہیں۔ اصطلاحی معنی رہ گئے ہیں۔ یعنی مطلب کا تار جانا۔ پا جانا تو لکھا ہے

مگر پائتارہ گیا ہے۔ پھوٹ نکلنا کے معنی اثر ہونا لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا مثال یہ دی ہے۔
 خدا کرے میرا نک پھوٹ نکلے۔ اس کے معنی اثر ہونے کے نہیں بلکہ یہ دعا ہے کہ میرا نک کھل کر
 جو مجھے یو فانی کی ہے تو اس نکھرا می کی سزا ملے۔ بھڑنا کے اصطلاحی معنی مقابل ہونا بتائے ہیں۔ یہ
 اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی ہیں ہندی میں بھڑنے اور بھٹنے کے لغوی معنی ملنے کے ہیں۔ مڈھ بھڑ
 یا مٹھ بھڑ میں یہی لفظ ہے اور دھنا کے معنی اُلٹا ہونے کے بتائے ہیں۔ مثال دی ہے کہ لوٹا اور دھنا
 ہے سیدھا کر دو، یہاں اور دھنا صفت ہے بعینہ جیسے سیدھا۔ اور دھنا استعمال میں نہیں آتا۔ اور دھنا
 البتہ درست ہے۔ بنگاڑنا بعض چغیا۔ لیکن اس کے اصطلاحی معنی نہیں لکھے۔ جولاف مارنا ہیں۔ اسی طرح
 برسنا کے اصطلاحی معنی کھنسنے سے رو گئے ہیں۔ پھسلنا کے صرف ایک اصطلاحی معنی لکھے ہیں دوسرے
 معنی چھوڑ دیئے ہیں۔ اُبتنا لکھا ہے مگر بُتنا نہیں لکھا۔ شاید غیر فصیح سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح تیور آنا مصد بھی
 اس رسالہ میں درج نہیں کیا گیا۔ شاید آج کل اس کا استعمال معیوب خیال کیا جاتا ہو یا متروک ہو گیا ہو
 بہر حال میرا نہیں تو استعمال کرتے تھے چنانچہ کے ایک معنی تخمینہ ہونا تو لکھا ہے مگر دوسرے معنی پسند آنا
 نہیں لکھے۔

یہ چند خفیف فروگزاشتیں ہیں جو سرسری نظر میں ہیں معلوم ہوئیں مگر ان سے کتاب کی اصل خوبی
 پر کوئی حرف نہیں آتا اور اُمید ہے کہ آئندہ ان کی اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن دو باتوں کی طرف ہم
 خاص طور پر خواجہ صاحب کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ ایک اعراب بڑے احتیاط کے ساتھ
 لگائے جائیں۔ بعض جگہ جہاں اعراب کی ضرورت تھی نہیں لگائے گئے اور بعض مقامات پر غلط اعراب
 لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے الفاظ کے درج کرنے میں ترتیب کا مطلق لحاظ نہیں کیا گیا۔ ہر حرف کو نیچے
 الفاظ بلا ترتیب لکھ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً الف کے تحت میں سب سے اوّل آنا آنا اس کے بعد انکھنا،
 آنکھنا، آنا اور پھر اُبتنا درج ہے۔ ایک لفظ کی تلاش میں ساری ردیف دیکھنی پڑتی ہے۔ اُمید ہے کہ
 آئندہ طبع میں اس کی اصلاح فرما دی جائے گی۔

مذہب

اسلام میں کوئی فرقہ نہیں۔ اس کتاب میں خواجہ کمال الدین صاحب امام مسجد وکنگ (انگلستان) مشہور اسلامی مشنری نے بدلائل اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کی طرح فرقے نہیں۔ یعنی اصول میں کہیں اختلاف نہیں، اگر ہی تو فردعی امور اور جزئیات میں ہے یعنی یہ ایسے امور ہیں جن میں اختلاف کرنے سے کوئی شخص اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ پر انھوں نے اس کتاب میں بہت اچھی بحث کی ہے۔ چوں کہ خواجہ صاحب انگلستان میں تبلیغ اسلام کا کام کر رہے ہیں اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ وہاں کے نو مسلموں کو کس فرقے کی تعلیم دی جاتی ہے کہیں وہ احمدی تو نہیں بنائے جاتے۔ اس کا جواب بھی خواجہ صاحب نے تفصیل سے دیا ہے اور اپنے عقیدے کو بھی صاف صاف بتا دیا ہے۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے بھی یہی سوال خواجہ صاحب سے کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس کے جواب میں ایک طویل خط جناب حکیم صاحب کے نام لکھا ہے جو اس کتاب میں درج ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں بیشک احمدی ہوں۔ لیکن میں جناب مرزا صاحب مرحوم کو مجدد، ولی اور پیر و مرشد سمجھتا ہوں، نبی نہیں سمجھتا۔ خود حضرت میرزا صاحب نے بھی کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں ص

”من فیتم رسول ونبی اور وہ ام کتاب“

اور یہاں کہیں انھوں نے اپنے لئے نبی کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس کے معنی حقیقی نبی کے نہیں ہیں، وہ اس سے ظنی، مجازی، بروزی، جزوی نبوت مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب اُن ادلیائے کرام کے متعلق جن میں سے وہ اپنے آپ کو بھی سمجھتے تھے یہ فرماتے ہیں۔

”وایشان را رنگ انبیا داده می شود۔ در حقیقت انبیا نیستند۔ زیرا کہ قرآن حاجت

شریعت را بحال رسانیدہ است“

خواجہ صاحب احمدیوں کے اُس فرقے کو بہت بُرا بھلا کہتے ہیں جو مرزا صاحب کو بنی مانتے ہیں۔ اور خود مرزا صاحب ہی کے اقوال سے اس کی تردید کرتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ احمدی فرقہ میں کوئی بات ایسی نہیں جو اسلام کے عقائد و اصول کے خلاف ہو۔ البتہ بعض جزئیات میں اختلاف ہو اور وہ ایسی ہیں کہ جس کے ماننے والے سلف صالحین میں بھی تھے۔ خواجہ صاحب انگلستان میں خالص اسلام اور کلمہ توحید کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کی تبلیغ کو کسی فرقے سے لگا دینا اور نہ وہ اسلام میں فرقہ بندی کے قائل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان سے بدگمانی کریں اور خواہ مخواہ احمدیوں کو اسلام سے خارج سمجھیں یا ان پر تبرائکین اور کفر کے فتوے دیں۔

خواجہ صاحب نے جو خط حکیم اعلیٰ خاں صاحب کو لکھا ہے اس میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ”بدشک میں سچتہ کار احمدی ہوں اور فطرنا اس امر کو چاہتا ہوں کہ دنیا میں احمدیت پھیل جائے۔ لیکن میری احمدیت کا مقدم حصہ یہی ہے جو میں نے اسلاماک ریویو میں تبلیغ کیا اور جس سے کسی غیر احمدی نے بھی آج تک اختلاف نہیں کیا۔“ جب یہ ہے تو پھر نیچ میں احمدیت کو لانے یا اسلامی تعلیم کو اس دُشمنوب کرنے کی ضرورت ہے خواجہ صاحب سچتہ کار احمدی ہوں اس سے کسی کو اختلاف کا حق نہیں۔ لیکن کہاری رائے میں یہی ایک تھوڑی سی خامی ان میں ہے۔ جو شخص اسلام سے فرقہ بندی مٹانا چاہتا ہے۔ سب سے پہلے خود اُسے اس قید سے آزاد ہونا چاہیے ورنہ اس بحث کا نام نہ لے۔

کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ بہت اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔ تقیہ چھوٹی صفحات ۲۰۸ قیمت قسم اول (چم) قسم دوم (دھڑ) مسلم بک سوسائٹی۔ عزیز منزل لاہور سے مل سکتی ہے)

جدید رسالے

الفلاح۔ یہ نیا رسالہ مہینے میں دو بار انجمن اشاعت اسلام جالندھر کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے اڈیٹر فازی رحمت اللہ صاحب ہیں۔ اس رسالہ کا مقصد دعوت و تبلیغ، اتقا و مذہب، نصیحت عقائد اور اصلاح اعمال ہے۔ اس رسالہ میں جو دوسرا نمبر ہے، ”وید، اسلام و مسلم، بقیہ شعبان و تہیہ رمضان، مسلم (نظم) اور

روڈ اوزمانہ مدرستہ القرآن کے مضامین ہیں۔ تبلیغ وغیرہ کے متعلق کسی قسم کی کوئی خبر یا اطلاع درج نہیں ہے۔ مضامین معمولی درجے کے ہیں۔ یہ رسالہ غالباً ہندو مسلم اختلاف کے زمانہ کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ رسالہ کے اس نمبر کی ضخامت ۷۷ صفحہ ہی لیکن معمولاً ۳۲ صفحہ ہوتی ہے سالانہ چندہ چار روپیہ ہی۔

نوائے ہند۔ یہ رسالہ انگلستان کی انجمن اُردو کا ہی جو انجمن ترقی اُردو کی شاخ ہی۔ اور ہندوستان کے طلبہ مقیم انگلستان نے مرتب کیا ہے۔ تمام مضامین نظم و ثرا نہیں صاحبوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ کوشش بہت قابل قدر ہے۔ وطن کی یاد کا اس سے بہتر وہ اور کیا ثبوت دے سکتے تھے۔ وہاں وہ خواہ کسی ملت و مذہب کے ہوں، ہم زبان و ہم خیال ہیں۔ خدا کرے جب وہ اپنے وطن واپس آئیں تو یہ جذبہ ان میں اور قوی ہو اور اپنے بد نصیب ہوطنوں کے لئے مثال بنیں۔ یہ رسالہ انجمن ترقی اُردو کی معرفت مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا ہے۔ کاغذ اعلیٰ درجہ کا، لکھائی چھپائی اس قدر نفیس اور پاکیزہ ہے کہ میری نظر سے اس زمانے میں کوئی کتاب یا تحریر اس پایہ کی نہیں گزری۔ قابل یہ ہے۔ اس کے لئے انسٹی ٹیوٹ پریس کے مستعد اور قابل منیجر مولوی محمد مقتدی خاں صاحب شروانی قابل ستائش ہیں۔ سال میں دو بار شائع ہوگا۔ قیمت فی پرچہ (۱۱) انجمن ترقی اُردو اور رنگ آباد، وکنسرل سکتا ہے۔ میں اس کی خریداری کی بطور خاص سفارش کرتا ہوں آپ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

علی گڑھ میگزین۔ یہ کوئی جدید رسالہ نہیں۔ علی گڑھ کالج سے یہ پہلے پہل جسے غالباً تیس سال ہوتے ہیں، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ضمیمے کے طور پر نکلتا تھا۔ کچھ دنوں بعد الگ شائع ہونے لگا۔ ایک حصہ اُردو دوسرا انگریزی ہوتا تھا۔ اس کی ترتیب میں آٹا دشاگرد و نون کا ہاتھ ہوتا تھا۔ مگر اس کی حالت کبھی اچھی نہ تھی اور شرم معلوم ہوتی تھی کہ علی گڑھ کالج سے ایسا رسالہ نکلتا ہے۔ چند سال ہوئے دفعۃً اس نے کبھی بدلی اور نئی رنگ روپ سے نکلا۔ اس کی تجدید و ترقی کا سہرا شید احمد صاحب صدیقی ایم اے کے سربرج انہوں نے اسے بنایا بڑھایا، خود لکھا دوسروں سے لکھوایا۔ اپنی طرافت نگار قلم سے کام لیا اور صاحب ذوق احباب سے مضمون بہم پہنچائے چند ہی روز میں اس کا شمار اُردو کے بہترین رسالوں میں ہونے

لگا۔ جب صدیقی صاحب طالب علمی کے حلقے سے نکل کر پروفیسری کے طبقے میں پہنچے (خوشی کی بات ہے کہ وہ آج کل پرنسپل ہیں اردو کے پروفیسر ہیں) تو یہ امانت یا نیورسٹی کے ہونما طالب علم خواجہ منظور صاحب سلمہ کے تفویض ہوئی۔ خواجہ صاحب نے اسے اور چمکایا اور اس کی ترقی و تربیت میں ایسی مستعدی اور محنت سے کام کیا کہ ماشاء اللہ اب اسے نظر لگتی ہی اور ہر مینے اس کا ظاہری اور باطنی جمال عروج پر نظر آتا ہے۔ خواجہ صاحب کی محنت لائق داد ہے اور اُن کا تقاضا قابل رشک مضمون کے لئے وہ اس طم پنچے جھاڑ کے پیچھے پڑتے ہیں کہ بغیر جھوٹے سچے وعدے کے اُن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے اور وعدے کے بعد اُن کے ہاتھوں سے صحیح سلامت بچکر نکل آنا محال ہی مجھے کالج میگزین کی ایسی اچھی حالت دیکھ کر حقیقی مسرت ہوتی ہے اور جب کبھی میں اپنے زمانے اور اس زمانے کے میگزین کا مقابلہ کرتا ہوں تو بے اختیار میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید یہی فرق اُس زمانے اور اس زمانے کے طالب علموں میں بھی ہے۔

ترقی اردو کے متعلق ایک نئی تحریک

اس میں شبہ نہیں کہ پنجاب کی ادبی زبان اب اردو ہو گئی ہے اور اہل پنجاب نے جس شوق اور محنت سے اس کے حاصل کرنے اور ترقی دینے میں کوشش کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل شکر ہے۔ لاہور اس صوبے کا علمی مرکز ہے۔ وہاں سے اس قدر اردو اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اور اردو کتابیں شائع ہوتی ہیں کہ ہندوستان کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ علاوہ اس کے مختلف انجمنیں خیالات و زبان کی ترقی کے لئے قائم ہیں۔ اہل لاہور کو اردو زبان سے جو دلچسپی رہی ہے اور اس وقت ہے وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ ہمارے ایک غنایت فرمانے ہیں طلسم دی ہے کہ حال ہی میں ایک نئی تحریک اردو زبان کی ترقی کے متعلق لاہور میں ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ پنجاب کو دلی و لکھنؤ کے اہل زبان کی نام نہاد سیاست سے آزاد کیا جائے اور اُن کی پیروی صرف اُس دور تک کی جائے جو اسیر اور داغ پر ختم ہو گیا ہے نئے الفاظ حسب ضرورت تجویز کئے جائیں۔ اور دلی و لکھنؤ کی زبان میں جہاں اختلاف ہو وہاں بھر محاورہ

اختیار کیا جائے۔ اس تحریک کو عمل میں لانے کے لئے مختصراً ایک ماہوار رسالہ بھی جاری ہونے والا ہے جس میں تمام مضامین صرف ادبائے پنجاب کی قلم سے ہوں گے۔ مختلف مضامین مختلف حضرات کے سپرد کئے گئے ہیں۔ وہ ان کا مطالعہ خاص طور پر کریں گے۔ پنجابی اور اردو زبان میں جو محاورے یکساں استعمال ہوتے ہیں یا جن میں بہت تھوڑا فرق ہو ان کی ایک لغت مرتب کی جائے گی۔

اس تحریک سے اہل لاہور کا شوق اور دلچسپی ظاہر ہے۔ ہم خوش ہیں کہ وہ اردو زبان کی ترقی اور اصلاح میں مصروف ہیں۔ اہل دہلی و کٹنوکو برا مانسنے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ ضرورت ہو تو ان کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ وقت ایسا ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے جو کوشش بھی کی جائے (خواہ وہ کیسے ہو) اُسے غنیمت سمجھا جائے اور اس کی قدر کی جائے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور چند مقامی الفاظ کے لئے جھگڑے کرنا زبان کی ہمدردی نہیں بلکہ دشمنی ہے۔ ہم اہل لاہور کو مبارک باد دیتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ ان کی سعی بار آور ہوگی بشرطیکہ ان کی تحریک عامیانه اور معاندانہ بحثوں سے پاک رہی۔

اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہر جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے شماروں میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ یہ سالانہ ادبی رسالہ ہر سال میں زبان وادب کے مختلف شعبوں اور پسلووں پر بحث و محققہ کم سے کم ۱۵۰، اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحوں پر ہوگا۔

۳۔ قیمت نو روپے بارہ آنے سالانہ معہ محصول ڈاک اور ارکان انجمن ترقی اُردو سے اٹھ روپے بارہ

۴۔ خط و کتابت آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو، اڈیٹر اُردو اورنگ آباد سے ہونی چاہیے۔
۵۔ محققین کی خاں شروانی مسلم یونیورسٹی، انڈیا ٹیوٹ پر میں علی گڑھ میں حصہ دار و فخر سے

